کلائمکس اینٹی کلائمکس

(افسانوی مجموعہ)

نثار احمد صدیقی

کلائمکس اینٹی کلائمکس

(افسانوں کا مجموعہ)

نثار احمد صدیقی

یہ کتاب محکمہ کابینہ سکریٹریٹ (راج بھاشا) اردو ڈائرکٹوریٹ، پٹنہ کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

CLIMAX ANTI CLIMAX

(AFSANO KA MAJMUA)

By

NESAR AHMAD SIDDIQUI

(Film Journalist & Writer)

Mob No. 9835205497,9546308801

Price:- 100/- Dlux Edition:-150/-

نامِ کتاب	:	کلائمکس اینٹی کلائمکس (افسانوں کا مجموعہ)
مصنف	:	نثار احمد صدیقی
سنِ اشاعت	:	۲۰۱۰ء
تعداد	:	۵۰۰ (پانچ سو)
مرتب وتزئین	:	ڈاکٹر احسان دانش
صفحات	:	۱۲۸
قیمت عام ایڈیشن	:	۱۰۰ روپے قیمت ڈیلکس ایڈیشن: ۱۵۰ روپے
ناشر	:	ادارہ فکر نو، کریم گنج، گیا
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	ممتاز احمد قمری، **پرنٹ آرٹس** کریم گنج، گیا
طباعت	:	ارم پبلیشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ-۴

کتاب ملنے کے پتے:

ادارہ فکر نو معرفت جنتا میڈیکل اسٹور، کریم گنج، گیا (بہار) ۸۲۳۰۰۱

بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-۸۰۰۰۰۴

انجمن ترقی اردو ہند، ۲۱۲، اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی، مارکیٹ، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۱

انتساب

ان تمام کرم فرما رفیقوں کے نام
جن کی
مہربانیوں نے مجھے یہ حوصلہ بخشا۔

نثار احمد صدیقی
معرفت جنتا میڈیکل اسٹور
پرانی کریم گنج، گیا (بہار) ۸۲۳۰۰۱
موبائل نمبر: 9835205497
9546308801

فہرست

کلائمکس اینٹی کلائمکس

وہ باغیچے میں گلاب کی کیاریوں کے پاس ایک بینچ پر بیٹھی تھی۔ صبح کا وقت تھا اور اکتوبر کی ٹھنڈی بوجھل بوجھل سی ہوا مشامِ جاں معطر کر رہی تھی۔ پھول آس پاس کھلے ہوئے تھے۔ زندگی کی چالیس بہاریں دیکھنے کے بعد بھی اُس کے چہرے پر اب تک شادابی تھی۔ دس سال پہلے شوہر کی ناگہاں موت نے پیٹریشیا کی زندگی ویران کر دی تھی۔ مگر اب سب کچھ معمول پر تھا۔ وقت نے بہت سے زخم بھر دیئے تھے۔ یا یوں کہا جائے کہ اس نے خود سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ آمدنی زیادہ نہیں تھی پھر بھی وہ اور اس کی اکلوتی سترہ سالہ بیٹی دونوں خوش تھے۔ قناعت اور سادگی، کفایت اور ہوش مندی سے پیٹریشیا نے تندو تیز وقت کا مقابلہ کر لیا تھا اور اپنا بھرم قائم کر رکھا تھا۔ کبھی وہ اپنی بیٹی سے کہا کرتی تھی کہ فضول خرچی نہیں کیا جاتا ہے، سارا ہنر تو احتیاط میں ہے۔ آدمی چاہے تو شرمندگی وخواری سے بچ سکتا ہے۔ ذاتی معاملات اور تعلقات میں بھی وہ بے حد محتاط تھی۔ ہر اُس بات سے احتراز کرتی جس سے ذہنی سکون پرگندہ ہونے کا اندیشہ ہو، مجموعی طور پر لوگ اُسے ایک ہمدرد اور باوقار خاتون سمجھتے تھے گئے دنوں میں اُسے بحث و مباحثہ کا شوق تھا۔ اپنی بات منوانے دلیلیں دینے کا شوق۔ اب بھی وہ سیاسی وسماجی بحثوں میں دل جمعی سے شریک ہوتی تھی مگر اپنی رائے سے ممکن حد تک اجتناب ہی کرتی تھی بلکہ اکثر و بیشتر اب ان اجتماعات میں اُس کی حیثیت ایک مبصر اور تماشائی کی ہوا کرتی تھی۔

پیٹریشیا نے ساڑھے نو بجے ناشتہ کیا تھا۔ اور اُس کی بیٹی سوزین اب تک غائب تھی۔ بہر حال میزبان اور دوسرے بہت سارے مہمان وقت پر ناشتہ کرنے نہیں آسکے تھے۔ اس لئے سوزین کی یہ غیر حاضری درگذر کی جاسکتی تھی۔ سوزین سرکشی کی حد تک شوخ تھی اور شاعری کی حد تک حسین۔ اتنی کم عمری میں وہ اپنی عمر سے بڑے لوگوں پر غلبہ پالیتی تھی۔ بلاشبہ اس میں اُس کی ذہانت کو بڑا دخل تھا۔ بسا اوقات وہ کمزور ارادے کے لوگوں کو تو زچ کردیتی تھی۔ ماں اپنی بیٹی کی اس سرکشی کو اُس کی ناپختہ کاری ہی پر محمول کرتی اور سوچتی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں لچک آ ہی جائے گی وقت تو سب سے بڑا قاتل ہے۔

پیٹریشیا اپنی سوچوں میں گم تھی کہ سوزین کی آہٹ سے چونک پڑی اور اُس کے چہرے پر شگفتگی چھا گئی۔ ''اتنی دیر میں اُٹھی ہو تم؟'' وہ کسی قدر ناراضگی سے بولی۔ ''اگر رات کو میری طرح جلد سو جاتی تو صبح اتنی دیر سے نہ اُٹھتیں۔ دیکھو فضا میں کیسی تازگی ہے مگر تم جیسے احمق بستر میں پڑے رہتے ہیں۔ دیر سے اُٹھنے کی وجہ سے تم نے ایک سہانی صبح کا لطف کھو دیا''۔

سوزین پر ابھی تک خوابیدگی طاری تھی۔ انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔ ''واقعی یہ ایک نرم و نازک صبح ہے''۔

''مجھے امید ہے کہ تم نے برج میں بڑی بڑی بازیاں نہیں لگائی ہوں گی۔ برج بہت کھیلنے لگی ہو تم''

سوزین نے ماں کی طرف جارحانہ انداز میں دیکھا اُس کی آنکھوں میں تھکن تھی۔ ''برج؟ نہیں تو۔ البتہ ایک دو بار کھیلے تھے رات کو پھر بیکارٹ شروع کردیا تھا''۔

''سوزین! تم زیادہ تو نہیں ہار رہی ہو نا؟'' پیٹریشیا نے مضطرب لہجے میں

پوچھا۔

''پرسوں رات کو میں بہت بڑی رقم ہار گئی تھی۔'' وہ بے پرواہی سے بولی۔ ''پھر یہ سوچ کر کل بھی کھیل میں شریک ہوگئی کہ ہارا ہوا حساب برابر کرلوں گی لیکن معلوم ہوا کہ بیکارٹ میرے مطلب کا کھیل نہیں ہے، کل میں پرسوں سے بھی زیادہ رقم ہار گئی۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم''۔ پیٹریشیا نے گھبرا کر کہا۔

''بس ہوگیا''۔ سوزین ہونٹ سکوڑ کر بولی۔

''بہت برا ہوا۔ میں تم سے سخت ناراض ہوں کتنی رقم ہاری''؟

سوزین اپنی انگلی میں ایک کاغذ لپیٹ رہی تھی اُس نے کاغذ سیدھا کیا اور تذبذب آمیز لہجے میں بولی۔ ''پرسوں میں سات سو دس ہاری تھی اور کل رات گیارہ سو بیس''۔

''گیارہ سو بیس کیا۔''؟

''پونڈ۔'' سوزین نے سادگی سے جواب دیا۔

''سوزین۔.یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔'' پیٹریشیا چیخ اُٹھی۔

''جی۔'' کل اٹھارہ سوتیس۔''!

پیٹریشیا گنگ ہوگئی کچھ دیر بعد سنبھل کر بولی۔ ''تم پاگل ہوگئی تھی؟ آخر ہم اتنی بڑی رقم کہاں سے دیں گے؟ ہمارے پاس تو کوئی چیز بھی اتنی قیمتی نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایک قلیل آمدنی میں ہم کتنی مشکل سے گذارا کر رہے ہیں۔ مزید کفایت شعاری کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ہم تباہ ہوجائیں گے۔ برباد ہوجائیں گے۔''

''ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ اگر ہم نے یہ رقم نہ دی تو سماجی طور پر برباد ہوجائیں گے پھر ہمیں کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔''

''آہ خدایا! تم نے نہ کام کیسے کیا سوزین۔؟'' پیٹریشیا کی آواز بھرا گئی۔

''اب یہ سوال کرنے سے کیا فائدہ ممی؟ جو ہونا تھا ہو گیا۔ میرا خیال ہے جوئے کا رجحان مجھے ورثے میں ملا ہے''۔

''ہرگز نہیں۔ تمہارے والد نے تاش کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا نہ وہ کبھی ریس کے قریب پھٹکے، اور مجھے تو تاش کے پتوں کی پہچان تک نہیں ہے''۔

''بسا اوقات یہ چیزیں دوسرے خونی رشتوں سے منتقل ہوتی ہیں۔ اور جب اگلی نسل میں پہنچتی ہیں تو اُن میں شدت آجاتی ہے''۔ سوزین اطمینان سے کہہ رہی تھی۔ ''ماموں کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟ وہ تو اسکول سے بھاگ کر اپنی کتابیں تک بازی میں لگا دیتے تھے۔ اگر وہ اتنی زبردست جواری نہ ہوتے تو مجھ میں یہ جراثیم کیسے آسکتے تھے''۔

''بحث مت کرو۔ سوچنا یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں''؟ پیٹریشیا جھنجھلا گئی۔ ''کتنے آدمیوں کا قرض ہے تم پر''؟

''خوش قسمتی سے ایک ہی آدمی کا۔ ایشلے جیروم کا''۔ سوزین نے بتایا۔ ''پرسوں اور کل زیادہ تر وہی جیتتا رہا تاش کا بڑا اچھا کھلاڑی ہے اسے آپ جانتی ہیں۔ بدقسمتی سے وہ زیادہ مال دار نہیں ہے اس لئے شاید جوئے میں جیتی ہوئی یہ رقم وہ نظر انداز نہیں کرے گا۔ وہ بھی ہماری طرح ایک مہم جوئی ہے''۔

''ہم مہم جو ہیں؟'' پیٹریشیا نے احتجاج کیا۔

''جو لوگ مہمانی کے شوق میں شہر آتے اور اپنی بساط سے زیادہ بڑی بڑی بازیاں جوئے میں لگا دیتے ہیں۔ میرے خیال میں اُنہیں مُہم جو ہی کہنا چاہیے''۔ سوزین تنک کر بولی۔ وہ اپنی ماں کو بھی اس لغزش میں ملوث کرنا چاہتی تھی۔

''کیا تم نے اُسے بتا دیا کہ ہم کس مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں''؟ پیٹریشیا نے متوحش لہجے میں پوچھا۔

''ہاں میں اس وقت آپ سے یہی بات کرنے آئی ہوں۔ میں نے ایشلے جیروم سے گفتگو کی تھی اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس کے قرض سے چھٹکارا پانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ وہ بہت تشنہ کام حسرت زدہ سا معلوم ہوتا ہے''۔

''حسرت زدہ'' پیٹریشیا چونک کے بولی۔

''ازدواجی عاشق مزاج'' سوزین نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''دراصل توقع کہ خلاف وہ محبت کا شکار ہو گیا ہے''۔

''ہاں وہ ایک شائستہ اور خوش اخلاق آدمی ہے۔ دوسروں کی باتیں توجہ سے سنتا ہے۔'' پیٹریشیا، ایشلے سے اپنی رسمی ملاقاتیں یاد کرتی ہوئے بولی۔ ''کیا واقعی اُس نے شادی کی پیش کش............''؟

''آپ ٹھیک سمجھیں۔ وہ شادی ہی کرنا چاہتا ہے۔ نہ معلوم وہ ایک مثالی شوہر ثابت ہو گا یا نہیں مگر اُس کی اتنی حیثیت ضرور ہے کہ اُس کے ساتھ اچھی زندگی گذاری جاسکتی ہے، کم سے کم اس سے تو اچھی، جیسی ہم گذار رہے ہیں۔ اس کے علاوہ خاصا وجیہہ اور شان دار آدمی بھی ہے۔ اگر ہم نے اُس کی پیش کش قبول نہ کی تو ہمیں اپنی چھوٹی سی جائداد فروخت کر کے اُس کے قرض اتارنا پڑے گا پھر میں کوئی ملازمت ڈھونڈتی پھروں گی اور آپ رات دن سوئی دھاگا لے کر اپنی آنکھیں پھوڑتی رہیں گی۔ فی الحال ہماری زندگی اچھی خاصی گذر رہی ہے۔ تھوڑی بہت عزت بھی ہے اور ہمیں تقریبات میں بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ اگر یہ آمدنی ختم ہو گئی تو زندگی عذاب ہو جائے گی۔ آپ کی رائے جو کچھ بھی ہو۔ مگر میرا خیال ہے۔ یہ تجویز زیادہ قابل اعتراض نہیں ہے''۔

''پیٹریشیا نے رومال نکال لیا''۔ اُس کی عمر کیا ہوگی''؟

''اڑتیس سال یا ایک دو سال زیادہ''۔

''کیا وہ تمہیں پسند ہے''؟

سوزین ہنس پڑی۔ آپ کو پسند ہے تو مجھے بھی پسند ہے۔ اور اب اس میں پسند نا پسند کا سوال بھی کیا ہے''۔

پیٹریشیا نے رونا شروع کر دیا۔ ''آہ ہم کس مصیبت میں پھنس گئے۔ ذرا سی رقم اور سماجی حیثیت کے لئے کتنی بڑی قربانی دینا پڑے گی۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کبھی ہم پر یہ پہاڑ ٹوٹے گا۔ میں نے بس کتابوں میں پڑھا تھا کہ بعض لڑکیوں کو معاشی ابتری کے باعث ناپسندیدہ آدمیوں سے شادی کرنی پڑتی ہے''۔

''آپ کو ایسی فضول کتابیں نہیں پڑھنا چاہیے'' سوزین نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

''مگر اب تو یہ ہمارے ساتھ بیت رہا ہے۔ میری اپنی بچی قربان ہو رہی ہے۔ وہ ایک ایسے شخص سے شادی کرنے پر مجبور ہے جو عمر میں اُس سے بہت بڑا ہے اور جسے وہ پسند بھی نہیں کرتی''۔

''نہیں ممی''۔ سوزین نے اُسے ٹوکا۔ ''میں شاید وضاحت نہیں کر سکی۔ وہ مجھ سے شادی کے لئے نہیں کہہ رہا ہے۔ اُسے مجھ جیسی شوخ اور سرکش لڑکیاں بالکل نہیں بھاتیں۔ وہ تو پختہ عمر کی عورتوں کا دل دادہ ہے۔ اُسے دراصل آپ سے محبت ہوگئی ہے''۔

''مجھ سے''؟ پیٹریشیا کی چیخ نکل گئی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی بیٹی کی صورت دیکھنے لگی۔

''ہاں۔ وہ کہتا ہے کہ آپ اس کا مثالیہ ہیں۔ آپ کی تعریف میں اُس نے نہ

جانے کیا کیا الفاظ استعمال کئے تھے۔ میں نے اُس سے صاف کہہ دیا کہ مسٹر۔ اگر ہمارے مالی حالات خراب نہ ہوتے تو میں ممّی سے ہرگز تمہاری سفارش نہ کرتی مگر اب .... یہ قرض صرف اسی صورت میں اتر سکتا ہے۔ ممّی! پلیز چند منٹ بعد وہ خود آپ کے پاس آنے والا ہے"۔

"لیکن بیٹی۔۔"

"مجھے معلوم ہے ممّی کہ آپ اُس سے زیادہ واقف نہیں ہیں۔ مگر ایسے حالات میں کیا کیا جا سکتا ہے۔ آپ ایک شادی پہلے بھی کر چکی ہیں اور سُنا ہے دوسرا شوہر ایک اینٹی کلائمکس کی طرح ہوتا ہے۔ اوہ .... دیکھئے ایشلے جیروم آ رہا ہے میں اب چلتی ہوں۔ ظاہر ہے آپ دونوں ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا چاہیں گے۔"

پھر چند دنوں بعد پیٹریشیا اور ایشلے جیروم کی شادی ہوگئی۔ شادی میں خاصے قیمتی تحفے آئے۔ مگر سب سے قیمتی تحفہ دولہا کی طرف سے دلہن کی بیٹی کے لئے قرض کی منسوخی کا پروانہ تھا۔!!!

☆☆☆

شوکیس

جیک نے اشارے سے ویٹر کو پاس بُلایا۔ ویٹر ادب سے جھک گیا۔ جیک نے سرگوشی میں پوچھا۔ ''وہ کون خاتون ہیں''؟ ہال کے درمیان میں ایک میز پر کوئی عورت بیٹھی تھی۔

ویٹر کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ اُبھر کر معدوم ہوگئی۔

''جناب! اس حسین وجمیل خاتون کے بارے میں یہ سوال بہت سے لوگ کر چکے ہیں، مرد بھی اور عورتیں بھی۔ یہ خاتون ہمیشہ تنہا نظر آتی ہیں مگران کی موجودگی ہم ویٹروں کے لئے اضافی آمدنی کا باعث ہوتی ہے۔ متجسس لوگوں کو ان کے متعلق معلومات بہم پہنچانے پر ہمیں اچھی خاصی بخشش مل جاتی ہے''۔

''ہوں''۔ جیک نے ہنکاری بھری۔ ''مگر...... موصوفہ ہیں کون''؟

''وہ مسز ہینیٹی ہیں جناب''۔ ویٹر مینور کہتے ہوئے اس طرح بڑبڑایا جیسے کسی خاص ڈش کے بارے میں انکشاف کر رہا ہو۔'' وہ ایک خاصی دولت مند بیوہ ہیں، گرمی اور خزاں دونوں موسم اسی ہوٹل میں گزارتی ہیں۔''

جیک نے مینو پر سرسری نظر ڈالی اور اپنے کھانے کا آرڈر دینے لگا۔ ویٹر آرڈر لے کر کچن کی طرف چلا گیا۔ جیک نے کنکھیوں سے عورت کا جائزہ لیا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی اُسی کے طرف متوجہ تھے۔ جیک کوئی حسن شناس آدمی نہیں تھا پھر بھی اُسے تسلیم کرنا پڑا کہ عورت واقعی حسین ہے۔ اُس کا نئے فیشن کا لباس بھی کسی مشہور اور مہنگے درزی کا تیار کردہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس لباس میں عورت کی شخصیت اور اُجاگر ہوگئی

تھی۔ ایک اور بات تھی جس سے جیک کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی مسحور کر رکھا تھا اور وہ تھے عورت کے زر و جواہر۔ اُس کے زیورات میں ہیرے جڑے تھے، ایسی تراش خراش کے ہیرے جیک نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ہزاروں پونڈ کے ہیروں نے بلاشبہ اس دبلی پتلی نوجوان بیوہ کی دل کشی میں غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا۔

کھانے کے بعد جیک نے ویٹر کو اچھی خاصی ٹپ دی، پھر دبیز لال قالین پر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ مسز ہینٹی کے نزدیک سے گزرتے ہوئے اُس نے اُس پر بھرپور نظر ڈالی۔ ہیرے یقیناً اصلی تھے۔ جیک کے منہ میں پانی بھر آیا۔

وہ ریسٹوراں سے نکل کر لاؤنج میں آ گیا۔ یہاں اُس نے ایک ایسی نشست سنبھالی کہ ریسٹوراں کا دروازہ اُس کی نگاہ میں رہے۔ مسز ہینٹی ریسٹوراں سے نکل کر اوپر جاتی ہال روم کا رُک کرتی یا کسی اور طرف نکلتی۔ اُس کا جیک کے سامنے سے گذرنا لازمی تھا۔ جیک نے کافی کا آرڈر دیا اور شام کا اخبار اُٹھا کے اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اب وہ پُر اسرار مسز ہینٹی کے نمودار ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اُسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس کا اندازہ اُس نے مسز ہینٹی کے قریب سے گزرتے ہوئے لگا لیا تھا۔ مسز ہینٹی اُس وقت آئس کریم سے دل بہلا رہی تھی۔

ڈائننگ ہال کے چاق و چوبند دربان نے مخصوص انداز میں دروازہ کھولا۔ زیورات سے لدی پھندی مسز ہینٹی خراماں خراماں لاؤنج میں آ گئی۔ وہ درمیانے قد کی ایک چھریری سی عورت تھی لیکن اُس کے جمال بے مثال، اُس کے لباس اور اُس کی شخصیت سے انفرادیت کا اظہار ہو رہا تھا۔

جیک اخبار کی آڑ سے اُسے دیکھتا رہا۔ عورت ایک خوش گوار جھونکے کے مانند قریب سے گذرتی ہوئی لفٹ کی جانب بڑھی اور لفٹ میں سوار ہو گئی۔ لفٹ کا دروازہ بند

ہو گیا۔ جیک آخری جھلک تک ٹکٹکی باندھے لفٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ لفٹ اوپر چلی گئی۔ اخبار جیک کے ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گر پڑا۔

کافی ختم کر کے جیک ٹہلتا ہوا ہوٹل کی سیر گاہ میں آ گیا۔ سیر گاہ سمندر کے کنارے کنارے پُشتے تک چلی گئی تھی۔ وہ پُشتے کی طرف بڑھنے لگا۔ اُسے تازہ ہوا اور تنہائی کی طلب تھی۔ مسز ہینیٹی کے خیالات نے اُسے پریشان کر رکھا تھا۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ جیک کے سلیقے سے جمے ہوئے بال بکھر چکے تھے۔ وہ بار بار اپنے آپ سے ایک سوال کر رہا تھا۔ یہ لڑکی تو کبھی میری بہن کے بچوں کی معلّمہ تھی مگر اب گرانڈ میٹروپول ہوٹل میں ایک دولت مند بیوہ کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ آخر یہ کیا ہے؟ اس کے پاس اتنے ہیرے اور جواہر کہاں سے آ گئے؟ صرف دو سال قبل تو یہ ایک قلیل سی تنخواہ کیلئے سخت محنت کرتی تھی۔ یہ اپنے کپڑے بھی خود سیتی تھی۔ اس کے پاس تھا ہی کیا؟

جیک کو یقین تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ گو اُسے اس لڑکی کو دیکھنے کا صرف تین بار اتفاق ہوا تھا۔ وہ اس سے مراسم پیدا کرنا چاہتا تھا وہ ملازمت چھوڑ کر چلی گئی۔ اُس نے ملازمت سے خود استعفا دیا تھا اور کوئی وجہ بتانے سے معذوری ظاہر کی تھی۔ اُس کا حسن بے عیب تھا اور اُسے کسی آرائش و زیبائش کی ضرورت نہیں تھی۔

اُسے دوسری بار جیک نے دیکھا تھا تو وہ اُس کی بھانجی کو باغ میں پڑھا رہی تھی۔ پھر جیک کی اُس سے تیسری مُلاقات بلکہ مُڈبھیڑ اپنی بہن کے مکان کے ہال میں ہوئی۔ ہال میں مدھم سی روشنی تھی۔ جیک نے ہمت کر کے اُس سے گفتگو کا جواز ڈھونڈ لیا۔ اُن کے درمیان ذرا سی بات چیت بھی ہوئی پھر اُس کی بہن آ ٹپکی اور اُس نے جیک کو کسی ضروری کام سے باہر بھیج دیا۔ لڑکی کا نام کلارائس تھا۔

چند روز بعد جیک اُس سے طویل ملاقات کیلئے پوری تیاری کے ساتھ اپنی بہن کے گھر پہنچا مگر کلارائس ملازمت چھوڑ کر جا چکی تھی اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں گئی ہے۔

عجیب معمہ تھا۔ جیک جس لڑکی کو لندن میں کلارائس کے نام سے جانتا تھا۔ وہ برائٹ سی کے اس شاندار ہوٹل میں بیش قیمت زیور پہنے ہوئے کیسے قیام پذیر ہے؟ اُس نے یہ سوانگ کیوں رچا رکھا ہے؟ جیک اسی شش و پنج میں غلطاں و پیچاں آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک موڑ پر گھومتے ہوئے اچانک کسی سے ٹکرا گیا۔ ''اوہ معافی چاہتا ہوں۔'' جیک نے بے ساختہ کہا ''مجھے اُمید ہے، آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچا ہوگا۔''

''خاطر جمع رکھیے جناب! میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔'' ایک میٹھی اور سریلی آواز نے جواب دیا۔ جیک چونک پڑا۔ اُس کے سامنے ایک عورت تھی جس کے جسم اور چہرے کا خاصہ حصّہ سمور میں چھپا ہوا تھا۔ عورت اپنا رُخ قدرے گھمایا تو اسٹریٹ لیمپ کی روشنی نے اُس کے نقوش نمایاں کر دیے۔ جیک کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ عورت نے گھبرا کے کہا۔ ''کیا بات ہے''؟

''مم...... مس کلارائس''؟ جیک ہکلاتے ہوئے بولا۔

عورت ایک دم روشنی سے نکل گئی۔ اُس کا چہرہ ایک بار پھر تاریکی میں چلا گیا۔ چند قدم بڑھنے کے بعد وہ دوبارہ تیزی سے پلٹی اور بولی۔ ''میں نہیں سمجھی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ غالباً آپ کو کوئی مغالطہ ہوا ہے''۔

''مجھے کوئی مغالطہ نہیں ہوا۔'' جیک نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''ہاں یہ بات الگ ہے کہ تم یہاں مسز ہنیٹی کے نام سے مشہور ہو۔''

''اوہ''۔ عورت نے لمبی سانس کھینچی۔ اُس نے دستانے میں چھپا ہوا اپنا ہاتھ جیک کے بازو پر رکھ دیا۔ ''آؤ، اس بینچ پر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ میں تمہیں بتاتی ہوں''۔

دونوں ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ عورت گویا ہوئی۔ ''ہاں میرا نام کلارائس ہے مگر یہاں میں مسز ہنیٹی کے نام سے مقیم ہوں۔ میں نے لوگوں کو یہی تاثر دیا ہے کہ میں ایک بیوہ ہوں۔ اور لوگ اس پر یقین بھی کرتے ہیں''۔ اُس نے جیک کا چہرہ دیکھا، پھر ہولے

سے مسکرائی۔ ”ہوسکتا ہے تم مجھ پر شک وغیرہ کر رہے ہو مگر ایسا کوئی چکر نہیں ہے“۔ اُس نے ملتجی لہجے میں کہا۔ ”میں ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی ہوں۔ سب کی طرح میں بھی زندگی سے بھرپور لطف اُٹھانا چاہتی تھی۔ اور بڑے حسین خواب دیکھا کرتی تھی۔ مجھے مسٹر فروبز آرٹ کی جانب سے ایک بہتر پیش کش ہوئی۔ میں نے وہ پیش کش قبول کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج میرے پاس ہر وہ چیز موجود ہے جو میں چاہتی تھی۔ زیور، ملبوسات اور اچھی غذا۔“ جیک اشتیاق سے اُس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کہتی رہی ”میں ہر سال گرمی اور خزاں میں یہاں آتی ہوں۔ اس کے علاوہ ڈیوول اور دیگر فیشن ایبل تفریح گاہوں میں بھی جاتی ہوں میرا قیام ہر جگہ بہترین ہوٹل میں ہوتا ہے اور میں انتہائی خوش نما اور بیش قیمت زیوروں سے سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتی ہوں۔ یہ سج دھج روز تبدیل ہوتی ہے۔ کل میں یاقوت جڑے ہوئے زیور پہنوں گی اور پرسوں سچے موتیوں کے زیور، یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا“۔ اُس نے کچھ توقف کیا۔ ”قریب قریب تمام عورتیں میری حرص کرتی ہیں۔ میرے زیور دیکھ کے اُنہیں بہت رشک آتا ہے۔ اور پھر اُس وقت تک چین نہیں پڑتا جب تک یہ چیزیں اُنہیں بھی نہ مل جائیں اور ظاہر ہے یہ چیزیں یہاں کی سب سے مہنگی دُکان ہی سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ بتاؤ سب سے مہنگی دُکان کون سی ہے“؟

”فروبز آرٹ جیولرز“ جیک نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔

”بے شک“

”تو کیا، تو کیا۔ یہ سب کچھ صرف تشہیری حربہ ہے۔“؟ جیک نے حیرت سے سوال کیا۔

”جی ہاں جناب! آپ کیا کیا خریدنا پسند فرمائیں گے؟“

☆☆☆

خشک آوازیں

شعلوں کی سرخی ارض وسماں کی وسعت میں شدت سے پھیلنے لگی، ریگ زار کا زیر زمیں رقیق دہک اُٹھا۔ ریگستان کے درو دیوار لرز اُٹھے۔ ساری فضا ایندھن کی طرح شعلہ بداماں ہوگئی۔ ہر فرد و بشر کے اندر اضطرابی لہریں پھیل گئیں۔ ہر ہونٹ پر ایک ہی سوال انگڑائیاں لے رہا تھا۔ یہ کیسی آگ ہے؟ اس قدر سوزش و تپش کیوں ہے؟ بجھانے پر اور کیوں بھڑک اٹھتی ہے؟ یہ آگ تو جسم و جاں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دے گی۔

لوگ خوف ودہشت سے لرزہ براندام تھے۔ بے چارگی اور بے پناہی کا احساس بحر بیکراں کی طرح پھیل رہا تھا۔ بشر کی زبان الاماں الاماں کے ورد سے سرخ ہو چکی تھی اور ان کی دردناک صدائیں اندھے پتھروں کے دروزوں پر دستک دے رہی تھیں۔ اس دہشت ناک گرج اور آتش دلگیر سے کئی چہرے ریزہ ریزہ ہو چکے تھے۔ ہر وجود پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ بدشکل وبدہیئت چہرے موت وزیست کی درمیانی لکیروں کے درمیان ایستادہ تھے۔ ان کی آوازیں خشک ہو چکی تھیں ان کے آنسو شعلوں میں جذب ہو کہ فنا ہو چکے تھے۔ ان کا آدھا وجود زندہ تھا ان کے جسموں کے گوشت سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ شہید و غازی کا معاسبہ کرنے والی زبان کٹ چکی تھی اور اسفل السافلین کی حکایتیں زندہ ہو رہی تھیں۔ آتش زدہ چہروں پر ایک ہی سوال تھا۔ کب آتش خانماں برباد سے نجات ملے

گی۔ سوزش وجلن کی اذیت ناک کرب سے کب نجات ملے گی؟ خوف ودہشت سے آوازیں لرز رہی تھیں، یاد الٰہی اور عذاب الٰہی کا ذکر زور وشور سے ہورہا تھا جن وبشر نے ورد وظائف کے بعد پوچھا۔ ''اب کیا ہوگا''؟

جن وبشر نے نیلگوں آسمان کی جانب دیکھا۔ وہاں صرف خلا ہی خلا تھا۔ گول دہکتا سورج منھ پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ انہیں محسوس ہوا وہ قطرہ بہ قطرہ فنا کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ ان کے وجود کی ہریالی لمحہ بہ لمحہ خشک سے خشک تر ہوتی جارہی ہے۔ اور اب وہ پیاسے شعلوں کے مانند بے چین وبے قرار ہیں۔ تشنہ لبی اور جانکنی کی اضطرابی کیفیت بڑھتی جارہی ہے۔ سجدہ ریزان حرم اپنی اپنی شکن آلود جبین نیاز دیکھ رہے ہیں۔ شناخت سے محروم ہونے والوں چہروں کے شمار میں مصروف ہیں۔ لیکن ان کی آواز خشک ہوتی جارہی ہے۔ معاً زبردست دھماکے سے ایک تیز روشنی بلند ہوئی۔ متحرک ہونٹ خود بخود ساکت ہوگئے۔ دست دعا میں لرزش آگئی سجدہ ریزان حرم چونک اُٹھے۔ ایک مجذوب کی گرجدار آواز فضا میں گونجی۔ ''یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟'' لوگ اس کی باتوں پر ہنس پڑے۔ سیاہ چہرے والوں نے اسے آگاہ کیا۔ ''چودہ صدی ختم ہوچکی ہے۔ تم نے نئی صدی کی دہلیز پر قدم رکھا ہے۔ نجات دہندہ کے ظہور کا وقت ہے۔ اپنی اپنی نگاہیں بصد احترام و ادب جھکالو کہ وہ تمہارے لئے جنت کی بشارت لایا ہے''!

جن وملائک، فرد وبشر، شجر وحجر، سکتے میں آگئے، حاضرین کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔ چشم وا حیرت واستعجاب میں ڈوب گئیں، ساکت لبوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی۔ ''آگ سے ظہور میں آنے والا جنت کی بشارت کیونکر لاسکتا ہے؟ جہنم کے پجاری نے جنت کی بات چھیڑی ہے''۔!

اخوان الشیاطین نے باآواز بلند نعرہ بلند کیا اور اپنی اپنی آستین چڑھالیں، ملائکہ کی سرزمین کشت وخون۔!!

حاضرین، افسردگی و سراسیمگی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، پھٹی پھٹی نگاہوں سے اخوان، الشیاطین کے رہبر کو دیکھا۔ اور اسفل السافلین کی حکایتوں کی نوک پلک سنوارنے لگے۔ رہبر کے دہن سے شعلے خارج ہو رہے تھے۔ اس کی سرخ آنکھوں سے دھوئیں کے مرغولے پھیل رہے تھے۔ اس کے جسم سے گندھک اور تیزاب کی بدبو پھیل رہی تھی اس کی تاریک چہرے اور سیاہ گھنے بالوں کے درمیان کالا ناگ پھن پھیلائے حاضرین کو ڈس رہا تھا۔ مرنے والوں کی ہڈیاں وہ خوفناک جبڑے سے چوس چوس کر پھینک رہا تھا۔ موت کا سناٹا اور قیامت کی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ فضا پر گہرا سکوت طاری تھا۔ اس نے خوفناک جبڑے کو کھول کر زبردست قہقہہ لگایا۔ ''اے زندہ قوم کی مردہ نسل! یوم الحساب اور یوم الوعید کی مجہول باتیں کرنے والو۔ تمہارا مہدی تمہارے روبرو آچکا ہے اور تم ہو کہ غفلت کی نیند سو رہے ہو۔ تمہاری دھرتی نے تمہیں من سلویٰ دیا لیکن تم بھوکے اور پیاسے ہو اور تمہاری شہ رگ پر تیز دھاری خنجر ہے!

معاً اس کے لبادے سے شعلہ جوالا پھوٹ پڑا، نگاہوں کو خیرہ کرنے والی تیز روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔ یک لخت اس کی آواز خشک ہو گئی۔ اسکی ہڈیاں چیخ چیخ کر راکھ ہو گئیں۔ گوشت اور ہڈی کی بدبو فضا میں پھیلنے لگی۔ چند لمحے میں اس کا وجود جل کر سیاہی مائل ہو گیا۔ لیکن اس کی زبان صحیح و سالم تھی۔ تر و تازہ زبان لیکن اس کی آوازیں خشک ہو چکی تھیں۔!!

☆☆☆

عقرب زدہ انسان

اس نے سمجھایا، خوف ودہشت تیری خمیر میں پیوست ہو چکی ہے۔ میں کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔ مجھے اپنے آپ سے خوف ہے۔ میرے اندر پلنے والا عفریت روز بروز دیو پیکر ہو رہا ہے اور اب وہ میرے پنجے پر عقرب کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ انگشت نیش عقرب کے مانند ہو چکے ہیں۔ اس میں تڑپا دینے والا زہر بھی سرایت کر چکا ہے۔ میں جس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ وہ کرب آلود ہو کر بے تماشہ بھاگتا ہے۔ وہ مجھے بھی عقرب ہی سمجھتا ہے۔ میں اُٹھنے لگا تو اس نے روک کر مزید کہا ''سنا ہے میں دھرتی پر آیا تھا تو اس قدر زور سے چلّایا تھا کہ سارے لوگ سہم گئے تھے، ہمسائے کے مردوزن میرا منھ دیکھنے کے لئے اپنا اپنا چراغ لائے تھے۔ انہیں گمان ہو چکا تھا کہ انسان کے بجائے راکشش تولد ہوا ہے۔ میرے ہیولیٰ سے انہیں قدرے تسلی ہوئی تھی تاہم وہ سہمے ہوئے تھے۔ مجھے کوئی مافوق الفطرت جانور سمجھ رہے تھے۔ انہیں یقین ہو چکا تھا۔ بستی پر نئی آفت نازل ہونے والی ہے۔ زیتون اور کیکٹس کے درختوں پر نئے کیڑے اترنے والے ہیں۔ میں نے اپنے لوگوں کے درمیان ٹوٹتے رشتوں کو دیکھا سفید وسرخ خون کا مزہ چکھا، طوطے کی آنکھ دیکھی، کتّے کو خرگوش کو خون پیتے دیکھا۔ البتہ اس عقرب کو اپنا وجود نیلا کر کے پہچانا۔ دھرتی عذاب کی زد میں ہے۔ خوشۂ گندم کے چکھنے کی سزا ابھی تک جاری ہے۔ انسان لذت وآسائش سے محروم ہو چکا ہے۔ مجھے محرومی کا غم نہیں۔ اندیشہ فردا سے سہما ہوا ہوں ابھی عقرب صرف پنجے پر قابض ہوا ہے۔ کل جسم کے کسی اور حصے پر بھی قابض ہو سکتا ہے۔ میں اسی عقرب سے لرزہ براندام ہوں۔

(۲)

میں نے حتمی فیصلہ کیا ہے کہ اس عقرب کو جو پنجے پر قابض ہو چکا ہے۔ کھرچ کھرچ کر زندہ یا مردہ الگ کر دوں لیکن اس کا جو زہر جسم میں سرایت کر چکا ہے وہ تو خون فاسد کر چکا ہے۔ اس زہر سے کیسے نجات مل سکتی ہے؟ اس زہر نے عجب کرشمہ دکھایا ہے۔ بھائی دشمن ہو گیا، بہنیں کنواری رہ گئیں۔ ماں کی آنکھوں پر جالے پڑ گئے، باپ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اسے تا دم حیات افسوس رہ گیا کہ میری تعلیم پر جو کچھ خرچ ہوا۔ سب ضائع ہو گیا۔ مجھے روزگار نہیں ملا۔ انہیں بھر پیٹ روٹی نہیں ملی۔ بہنوں کے لئے جہیز کا سامان نہیں آیا۔ اور ماں کی آنکھ کا علاج نہیں ہو سکا۔ میں ان کی تقدیر نہیں بدل سکا۔ میرے لئے انجانے دیش سے ویزا نہیں آسکا۔ اور میں تہی دست و تہی جیب رہ گیا۔ میں کھوٹے سکّے کی طرح ہلکا ہو گیا۔ برادران کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتے ہیں تو میں انہیں بتانا چاہتا ہوں۔ خلیفۃ المسلمین نے قبیلۂ انصار کے ایک فرد کو اپنا بھائی بنایا تھا جب وہ مفلوج ہوا تو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اسے کھلایا۔ اس کے زخموں کو صاف کیا، اس نہلایا، اسے کپڑے پہنایا۔ اور اسے گلے سے لگا کر رکھا۔ لیکن اس عہد کے خون میں عجیب زہر سرایت کر گیا ہے۔ بھائی بھائی کا خون پی کر خوش ہوتا ہے۔ اور بچھو کی طرح ڈنک مار کر مسکراتا ہے۔ گھر کے آنگن کے کونے میں ایک تودہ ہے۔ اس تودے میں دیمک کی ایک نسل آباد ہے۔ اس تودے میں بے شمار سوراخ ہیں۔ باپ نے بتایا تھا اس کے اندر خزانہ دفن ہے۔ میں نے خزانے کی لالچ میں مٹی ہٹائی تو بے شمار بچھو نکل پڑے۔ آنگن میں ادھر اُدھر دوڑنے لگے۔ میرے ہاتھ اشرفی کی بجائے بچھو آ گئے۔ باپ کو رحلت کئے عرصہ ہو چکا ہے لیکن ہنوز آس باقی ہے۔ مقدر کا ستارہ کبھی نہ کبھی ضرور روشن ہوگا۔ میں دن بھر ٹھوکریں کھانے کے بعد مایوسی کے عالم میں گھر کے اندر قدم رکھتا ہوں آہٹ سے میری ماں مجھے پہچان لیتی ہے۔ ایک ہی سوال دہراتی ہے جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ دلاسہ اور تسلی کے صرف چند الفاظ ہیں جواب اپنی

معنویت سے محروم ہو چکے ہیں۔ ساری اُمیدیں تارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹتی جا رہی ہیں۔

(۳)

دل غم کو کھا رہا ہے یا غم دل کو کھا رہا ہے۔ دیمک مٹی کے تودے میں ہے۔ یا تودہ دیمک پر ایستادہ ہے۔ کہنا مشکل ہے۔ مشہور کہانی ہے۔ شیر کا بچہ گیدڑ کے جھنڈ میں شامل ہو گیا۔ اس کی خمیر اور شرست تبدیل ہو گئی وہ بھی بھیڑیے اور شیر کی آہٹ پر دُم دبا کر بھاگنے لگتا۔ اب مسئلہ صرف عقرب کا ہے جس نے انگشت کو زہریلے ڈنکوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ جب میں نے طے کر لیا کہ اس عقرب کو تراش کر الگ کر دوں تو اسی لمحے میں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اس عقرب کا آخری زہر دھرتی میں دفن کر دونگا۔ چنانچہ میں نے گھر کے آنگن کی مٹی کے تودے کی مٹی ہٹائی۔ بچھو نکل کر آتے۔ تھوڑی دور ہٹ کر رک جاتے۔ میں مٹی ہٹاتا چلا گیا۔ دیمک اور بچھو ہر طرف بکھر گئے۔ بہت سے میرے جسم پر بھی رینگنے لگے۔ آخر کار سرخ تھیلی میں بندھا ہوا خزانہ میرے ہاتھ آ گیا۔ میں نے کراسن تیل چھڑک کر مٹی میں آگ لگا دی۔ بچھوؤں نے اپنی ذات کا فرد تصور کر کے۔ مجھے راہ دے دی تھی۔ برادران چراغ پا تھے کہ میں نے آگ کیوں لگائی۔ سرخ تھیلی کے لئے ہاتھا پائی ہونے لگی۔ میں نے عقرب والے پنجے کی بدولت سبھی کو دبوچ لیا۔ فاتح کی طرح بیٹھ کر تھیلی کھولی تا کہ ہیرے، جواہرات، چاندی اور سونے کے سکّوں کا حساب کروں۔ لیکن وہاں تو معاملہ ہی دوسرا پیش آیا۔ تھیلی بچھوؤں سے بھری ہوئی تھی۔ سارے بچھو نکل کر میرے جسم سے پیوست ہو گئے۔ میرا جسم نیلا ہو گیا تو میں بلبلا اٹھا۔ میں رونے اور تڑپنے لگا۔ میں نے صرف ایک بچھو سے نجات کی کوشش کی تھی۔ اس کے برعکس بچھو ہی بچھو میرے جسم سے پیوست ہو گئے میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر فریاد کرنے لگا تو اندھی ماں نے کہا۔ ''خزانے کا راستہ مجھ سے دریافت کر لیا ہوتا۔ اپنے کئے پر اتنا چھٹپٹاتے کیوں ہو''؟ میں روتا ہوا سوچتا ہوں۔ کیا ماں کو بیٹے سے یہی کہنا چاہیئے۔ وہ مجھے تسلی ہی دیدیتی تو کیا ہوتا۔!!!

☆☆☆

کینوس پر ایک زندہ تصویر

سمندر سویا ہوا تھا۔

نہیں۔ سمندر کبھی سوتا نہیں ہے۔ یہ لہریں لینا اور گنگنانا تو ہزاروں سال سے جانتا ہے۔

آخر سمندر کیوں نہیں سوتا؟ اس نے اپنے دل میں سوچا۔

اُس وقت اُسے ایسا محسوس ہوا کہ سمندر سویا ہوا تھا۔ لیکن نیند گہری نہیں تھی۔ وہ کسی وقت بھی جاگ سکتا تھا۔ اُس کے نیلے پانی میں ادھے چاند کا عکس تھرک رہا تھا۔ اور دور کھڑے جہاز کی روشنیاں پانی میں ہچکولے کھا رہی تھی۔

وہ ساحل پر کھڑا دیر تک سمندر کے ان حسین مناظر میں غوطہ زن رہا۔ لیکن وہ بہت اُداس تھا۔ سمندر کا وہ کنارا ریتلا نہیں تھا۔ کنکریٹ اور پتھروں کا بنا ہوا پختہ کنارا تھا۔ جو ایک طرف سمندر کے پانی کو روکے ہوئے تھا۔ اور دوسری طرف شہر کے سڑکوں سے لگا ہوا تھا۔ جو سمندر کی سطح سے بہت اونچی تھی اور اُس میں کئی جگہ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں اُن سیڑھیوں سے نیچے اتر کر پانی میں کھڑی کشتیوں تک جایا جاتا تھا۔ کشتیاں سیر کرانے کی غرض سے کنارے کھڑی کی جاتی تھیں۔

سمندر کی لہروں سے نظریں ہٹا کر کشتیوں کی طرف دیکھا تو وہ ان کشتیوں کے

خیالات میں کھو گیا۔ اور اُسے ماضی کی ایک حسین تصویر یاد آنے لگی۔ اُس نے بہت پہلے ایک سمینار میں ایک خوبصورت سی تصویر دیکھی تھی۔ شفق کی ہلکی سرخ کرنیں کشتیوں پر پڑ رہی تھیں۔ لیکن ان سرخ روشنیوں میں بڑی اُداسی پنہاں تھی۔

ہزاروں چھوٹی بڑی کشتیوں میں لالٹین کی مدھم روشنی اور جہازوں کی تیز روشنی سمندر کی سطح آب پر جگ مگا رہی تھیں۔ اور اس جگمگاہٹ کو سمندر کی لہریں اپنی آغوش میں لے لی تھیں۔ ہاں! آرٹسٹ نے اُس تصویر میں اسی جگہ کے منظر کو پیش کیا تھا۔ اُس نے اپنے دل میں سوچا وہ جب بھی یہاں آیا تھا اور کشتیوں کو دیکھتا تو اُسے اُس تصویر کی یاد آجاتی تھی۔ اور وہ اس کی یاد میں کھو کر رہ جاتا تھا۔ حالانکہ اس منظر سے بھی حسین منظر دوسری طرف رہتا تھا۔ لیکن وہ تمام مناظر کو بھول کر اس منظر کی تصویر میں غوطہ زن ہو جاتا تھا۔ منظر دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ اس کا اُس وقت دھیان ٹوٹا جب اس کے نزدیک ایک حسین لڑکی کھڑی کشتی میں سیر کرنے کے لئے کہہ رہی تھی۔

اُس نے سر انکار میں ہلا دیا۔!

خیالات کے قلعے بکھر گئے اور اُسے اپنے سامنے ایک زندہ تصویر نظر آنے لگی۔ وہی تصویر جو اُس نے سیمینار میں دیکھی تھی۔ جب پہلی دفعہ اس نے تصویر کو دیکھا تھا تو دیکھتا رہ گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس تصویر میں جو بھی رنگ استعمال کئے گئے ہیں وہ سب اس تصویر کا ضروری جز تھے۔ اس تصویر کو دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ دو مرتبہ سیمینار گیا اور پھر بہت غور سے اُس تصویر کو دیکھا تھا۔ اس تصویر میں ہر چیز اس سمندر کے منظر سے ملتی تھی۔ صحیح معنوں میں آرٹسٹ نے اپنا خونِ جگر دیکر تصویر مکمل کی تھی۔ اس تصویر کی قیمت چودہ سو روپے تھی۔

اس نے سوچا کہ اگر اس تصویر کو لیکر دیوار میں لگا دے تو پھر دیوار ایک بڑا سمندر نظر آنے لگے گا مگر وہ مجبور تھا۔ غریب تھا۔ لیکن خیالات پر کوئی پابندی لگا نہیں سکتا

اس لئے اس کے خیال پاک وصاف اور آزاد تھے۔

ویسے کئی بار اس نے اس تصویر کا خواب دیکھا۔ لیکن ہر مرتبہ خوابوں کے جزیروں میں بھٹک کر رہ گیا اور پھر آرزؤں کے مسمار کر دیا۔ اور بالآخر دیوار، دیوار ہی رہی، بالکل صاف تصویر سے پاک اور ٹھوس، لیکن اُداس۔

اور اُس وقت سامنے جو تصویر تھی۔ ابھر کر وسیع سمندر میں جذب ہوگئی۔ اور وہ ساحل پر کھڑا سوچ رہا تھا۔

اس سمندر کے ساتھ اس کی کچھ یادیں وابستہ تھی۔

ایک بار اُس نے شیاما کے ساتھ یہاں آنا چاہا تھا۔ شیاما سے اچانک ملاقات ہوئی تھی۔ اور بعد میں برابر ہوتی رہی۔ لیکن یہ ملاقات زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی تھی۔ اس بات کو دونوں جانتے تھے۔ کیونکہ گھر کے افراد درمیان میں حائل تھے۔ پھر بھی وہ دونوں ایک دوسرے سے برابر ملتے رہتے تھے۔ اچانک ایک دن اُس نے شیاما کو اپنے ساتھ لیکر کشتی میں سیر کرنا چاہا تو شیاما اس موقع پر اُسے دھوکا دے گئی، اور وہ مقررہ وقت پہ نہ آئی۔ اس نے سوچا کہ ایسا یقیناً ایک دن ہوتا۔ لیکن پھر بھی اُسے یقین تھا۔ ہاں! اُسی دن اچانک شیاما اس شہر سے کسی اور شہر چلی گئی تھی۔ جس کا اُسے پتہ بھی نہ تھا کہ وہ کونسا شہر ہے؟ اس کے والدین اس قدر خائف کیوں ہو گئے تھے۔ شیاما اس قدر کیوں ڈر گئی؟ کم از کم خط تو لکھ سکتی تھی۔ لیکن اُسے میرا پتہ کہاں معلوم تھا۔ وہ کس پتہ پر خط لکھتی؟

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا۔ شیاما نہیں آئی تھی۔ وہ اس کے انتظار میں دیر تک بیٹھا رہا تھا اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ کیوں نہ اکیلے ہی کشتی میں سیر کیا جائے لیکن پھر اُس نے خیال کو جھٹک دیا۔

ہاں! کچھ دنوں قبل ایک مرتبہ وہ کشتی میں اکیلے بیٹھا تھا۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ شیاما کے بغیر کشتی کی سیر میں لطف لے سکتا ہوں یا نہیں؟

اور پھر وہ اداس ہو گیا۔ اداسی اس وسیع سمندر میں بھی نظر آنے لگی جو رات کے اندھیرے میں سویا ہوا تھا۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کہ سمندر کبھی سوتا نہیں ہے۔

اُس دن جب سیمینار میں اُس نے سمندر کا ایک منظر تصویر میں دیکھا تو اُسے شیاما بہت زیادہ یاد آئی تھی۔ شاید آرٹسٹ کی بھی ایک شیاما ہوگی جس کی یاد میں اُس نے ایسی تصویر بنائی تھی۔

کافی رات گذرنے پر وہ سمندر کے ساحل سے اُٹھا اور اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ اُس وقت اس کے آگے اور پیچھے سمندر تھا۔ جو پیچھا کر رہا تھا۔ وہ بھی بہت گہرا تھا۔ لیکن خاموش۔!!

بارودزدہ چہرہ

راتوں رات یہ منصوبہ خاک آلود کیوں ہوگیا۔؟؟

سبھی تشویش آلود نگاہوں سے سونے کے گنبد اور محراب نما عمارت کی جانب دیکھنے کے بعد، ایک دوسرے کو مبہم سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اپنے لہولہان چہرے کا عکس پانی کی متلاطم موجوں میں دیکھ کر، مزید سہم جاتے ہیں اور پھر سبھی الوداعی اشارہ پا کر اپنے اپنے کمروں کی تاریکی میں روپوش ہو جاتے ہیں اور ان کے سائے، سر جھکائے برہنہ انداز سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں کہ اپنے کاموں میں مصروف ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ملگجی سی تاریکی نے ان کے وجود کو ساکت کر کے، ان کے سائے اور جسم کو الگ کر دیئے ہیں۔ لیکن ان کا کیا کام ہے۔؟؟

اسلحوں کی زد میں جنسی کھیل۔!!

اندھیرے سے اوب کر وہ اپنے کمرے کی چھت پر آ گیا۔ محراب نما عمارت کا بلند دروازہ چاندنی میں یوں نظر آ رہا تھا جیسے کوئی صاف وشفاف فرشتہ پر پھیلائے کھڑا ہے۔ اس نے دروازے کے محراب میں چاند کو مسکراتے دیکھا۔ اس کا چہرہ مسرت و شادمانی سے کھل اُٹھا۔ سنگ مرمر کے ٹکڑوں پر چاند سیم خام کی چادر ڈال دی تھی۔ منظر بے حد سہانا تھا۔ اس نے نگاہ آسمان کی جانب اٹھائی۔ نیلے آسمان میں مسکراتا ہوا چاند،

بادلوں کی مہیب چٹانیں، تیز ہواؤں کا جھونکا، سیاہ وسفید بادلوں کا سنگم۔ وہ رنگین مناظر میں ڈوب جاتا ہے اوشراب کی کئی بوتلیں متواتر خالی کردیتا ہے۔ اور پھر اسکی نگاہیں سنہری عمارت کے چاروں طرف پھیلی ہوئی وردی پوش فوج پر پڑتی ہے جنہوں نے سارے برقی اور مواصلاتی انتظام معطل کردیئے ہیں اور اس حصار بندی کو انہوں نے فرنٹ یعنی محاذ کا نام دیا ہے۔ اس فرنٹ پر حق وباطل، سفید وسیاہ سچ اور جھوٹ کی درمیانی لکیر کھینچی ہوئی ہے۔ ان لکیروں سے وردی پوش عفریت دیوانہ وار نکلتے ہیں اور سنہری عمارت کی دیواروں میں جذب ہوکر دم توڑ دیتے ہیں۔ ان کی حصار بندی ٹوٹتی ہے اور پھر استوار ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے ذہن میں ایک ہی سوال گونجتا ہے۔

یہ منصوبہ خاک آلود کیوں ہوگیا۔؟؟

وہ تیزی سے زینے کی مسافت طے کرکے کمرے میں داخل ہوا جہاں برہنہ لڑکیاں نیم دراز تھیں۔ اس نے اندھیرے میں ایک کا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹتا ہوا اوپر لے آیا لیکن صاف وشفاف چاندنی میں ابھرے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر تلملا اُٹھا۔ اس نے نشے کے عالم میں پوچھا۔

''آج کبوتروں نے غٹرغوں کی آوازیں لگائی تھیں۔''؟؟

برہنہ عورت نے جواب دیا۔ ''میں نے برسوں سے کوئی آواز نہیں سُنی۔''!!

یہ سن کر اس کے جسم پر چیونٹی رینگ گئی۔ اس کا پورا جسم غصے سے کانپنے لگا۔ وہ غضب ناک آواز میں گرجا۔ ''تمہارے کان بہرے کردیئے جائیں گے اور تمہاری بصارت چھین لی جائے گی۔ اور تمہیں قطرہ بہ قطرہ پگھلا کر اسی پانی میں تحلیل کردیا جائے گا۔''!!

وہ تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا محراب نما عمارت کے ان کمروں کی طرف آیا جہاں قندیلیں روشن تھیں۔ وسیع سائبان میں فانوس اپنی نورانی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ اس

نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا اور آہستہ آہستہ پلنگ کی طرف بڑھنے لگا۔ پلنگ پر حسین و جمیل دوشیزہ بانہیں پھیلائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے اور جسم کے ایک ایک انگ سے شراب ٹپک رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مئے بھرا جام تھا۔ اس نے پلنگ تک پہنچتے پہنچتے اپنے خوبصورت گٹھے ہوئے جسم کو لباس سے آزاد کر دیا۔ اور پھر اپنے ہونٹ حسینہ کے ہونٹ پر جما دیئے اور کسی نے باہر سے اندرونی کمرہ کا سوئچ اُف کر دیا۔

سورج کی تیز روشنی محراب نما عمارت پر پڑی اس وقت دونوں شب باشی کے بعد اپنی نیند سے بیدار ہوئے۔ دونوں نے اپنے ہاتھ ایک دوسرے کے برہنہ جسموں پر پھیرے اور صبح کا پہلا بوسہ دونوں نے ایک دوسرے کے ہونٹ پر ثبت کیا۔ اور ملحق باتھ روم میں دونوں نے خوب مل مل کر ایک دوسرے کے جسم سے رطوبت صاف کی اور تازہ دم ہو کر اپنا اپنا لباس زیب تن کیا۔ دریں اثنا کمرے میں ناشتہ لگ چکا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر تازہ پھلوں کا رس پیا اور شکم سیر ہو کر ناشتہ کیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا— یہ آخری ملاقات ہے۔ وردی پوشوں نے ناقہ بندی کر دی ہے اس لئے فی الحال راہ فرار اختیار کرنا لازمی ہے۔ زندہ رہا تو پھر اسی سنگ مرمر کی عمارت میں دوبارہ ملوں گا۔ !!"

اور پھر دونوں کے چہرے مغموم ہو گئے۔

اور پھر!!

سونے کی گنبد کی بیچوں بیچ سے خوبصورت نوجوان وارد ہوا۔ صاف و شفاف کرتا، پائجامہ، سلیم شاہی جوتا، بہت تیکھا، بہت اسمارٹ، اس نے ایک شانے سے پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر لٹکا رکھا ہے، دوسرے شانے سے موی کیمرہ اور مشین گن، گلے میں ساکت تصاویر کھینچنے والا کیمرہ اور ایک ہاتھ میں مائیکروفون۔ وردی پوشوں نے اسے

محاصرے میں لے لیا لیکن اس کا شناختی کارڈ دیکھ محاصرہ کائی کی طرح پھٹ گیا۔ شاہدرہ پر آکر اس نے ٹیکسی کو آواز دی اور پھر روانہ ہو گیا۔ اس نے رخ پھیرا اور اس کی پشت پر کشت وخون کا کھیل شروع ہو گیا۔

وہ چنڈی گڑھ ائیر پورٹ سے نیپال ائیر پورٹ پر سوار ہوا۔ سفر جوں ہی شروع ہوا۔ ائیر ہوسٹس سے اس نے اخبار طلب کیا۔ فرنٹ پیج پر اپنی ہی مصنوعی شبیہہ دیکھ کر مسکرا اُٹھا۔ اس نے چھپی ہوئی خبر پڑھنا شروع کیا۔ ''پنجاب کے گولڈن ٹیمپل میں پڑوسی مما لک کا ہاتھ ہے۔ دو ماہ کے اندر فوج سارے مسائل پر کنٹرول حاصل کر لے گی۔ فوج نے جتنے اسلحہ جات قبضے میں لی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہتھیار بیرونی مما لک سے آئے ہیں۔ جاسوسوں نے اشاعت کے لئے یہ تصویر دی ہے۔ اس شخص کی گرفتاری کے سارے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ یہ آدمی بیرونی مما لک کا ایجنٹ ہے۔!''

اس نے اخبار موڑ کر ائیر ہوسٹس کو واپس کر دیا۔ اور پلاسٹک سرجری کی داد دینے لگا کیونکہ تصویر میں ایک سردار جی کی شبیہہ تھی اور اس وقت وہ ایک نیپالی نوجوان کے روپ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور ہلکے نشہ والی شراب رہ، رہ کر پی رہا تھا۔!!!

☆☆☆

پہچانا ہوا انجان شہر

کئی برسوں بعد گھر آیا ہوں۔ اس بڑے شہر میں اکثر مجھے اپنے شہر کی گلیاں اور اپنی گلی کے لوگ یاد آتے تھے۔ دس بارہ سال بعد یہاں کتنا کچھ بدل گیا ہے۔ گلیاں پہلے سے تنگ لگتی ہیں۔ لوگوں کے چہرے بھی بدل سے گئے ہیں گنگو حلوائی کی دوکان پر کام کرنے والا چھوٹا سا لڑکا اب جوان ہو گیا ہے۔ اور اب اس نے اپنی دوکان کھول لی ہے گھر کے سامنے والی خالی زمین پر ایک اونچا سا مکان بن گیا ہے۔ یہاں کبھی ہم لوگ گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔ یہ مکان ایک بڑے بابو نے بنوایا ہے۔ اپنا مکان مجھے نہ جانے کیوں پہلے سے بہت زیادہ گندا لگا۔ اس کی دیواریں بڑھیا کی کمر کی طرح ٹیڑھی ہو گئی ہیں اور چھتیں لٹک گئی ہیں۔ اب یہ مکان مجھے اپنے بوڑھے ریٹائرڈ پتا کی طرح تھکا ہارا سا لگتا ہے۔

میں صبح سے اس کمرے میں بیٹھا ہوں۔ بالکل اکیلا ماں کچن میں کام کر رہی ہے۔ چائے کمرے میں ہی پہنچا دی گئی ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں اس گھر کا مہمان ہوں، جس کی خاطر مدارات کی جا رہی ہے۔ دوسرے کمرے میں پتا جی ہیں۔ جب سے آیا ہوں۔ انہوں نے بات بہت کم کی ہے۔ کسی طرح کی کوئی شکایت بھی نہیں کی۔

جب میں آیا نہیں تھا تو خط میں بہت ساری شکایتیں لکھا کرتے تھے۔ اور آج جب میں ان کے سامنے ہوں تو وہ سب شکایتیں بھول سے گئے ہیں۔

صبح انہیں دھوپ میں بیٹھا دیکھا تھا۔ اب وہ کتنے بدل گئے ہیں۔ ماں بھی کتنی بدل گئی ہے۔ اب وہ مجھے باہر گھومنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ میں اب باہر ٹہلنے کے

لئے نکل گیا ہوں۔ شہر مجھے بڑا ہی انجانا سا لگ رہا ہے۔ لیکن لوگ جانے پہچانے سے نظر آرہے ہیں۔ جگہیں بھی پہچان رہا ہوں۔ پھر سوچتا ہوں اس شہر میں اتنے لوگ کہاں سے آگئے ہیں؟ ایک سوال ذہن میں اٹھنے لگا ہے۔ تھوڑی دیر سڑک کے کنارے اکیلے کھڑے رہنے کے بعد جان پہچان کے لئے نندو کی دوکان سے دوسگریٹ مانگتا ہوں۔ اِس دوکان پر پہلے بھی یہی سگریٹ پیا کرتا تھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے دوسگریٹ نکال کردیئے، مجھے یاد ہے جب اس کی دوکان پر چھپ کرسگریٹ پیتا تھا تو وہ مجھے ہرطرح کی خبریں دیا کرتا تھا۔ لیکن آج کے اخلاق سے ہمت نہیں ہوئی کہ اس سے بات چیت کروں۔ پاس ہی حلوائی کی دوکان بھی تھی۔ لیکن جانے پہچانے لوگوں کو پھر سے اپنا تعارف کرانا اچھا نہیں لگا۔

کاش! کوئی اپنا ساتھی مل جائے جو دیکھتے ہی پہچان لے اور گلے سے لپٹ جائے۔ پتہ نہیں اب وہ لوگ کہاں ہوں گے۔ ہاں! دلیپ ہی ایسا ہے جو پہچان کر گلے سے لپٹ جائے گا۔ دلیپ کی یاد آتے ہی اس کے گھر کی جانب چل پڑا ہوں۔ دروازے تک پہنچنے میں تھوڑی دیر لگ گئی ہے۔ دو دفعہ دلیپ کے دروازہ پر آواز دیتا ہوں، لیکن کوئی جواب نہیں ملتا۔ ایسا محسوس ہورہا ہے کہ میں نے یہاں آنے کی سب بڑی غلطی کی ہے۔ ایک آواز پھر دیتا ہوں۔ ایک عورت کی آواز اندر سے آتی ہے۔ آواز کو میں نہیں پہچان پاتا ہوں۔ آواز بڑی سریلی ہے۔ ''دفتر گئے ہیں''۔! مختصر سا جواب سن کر میں خاموشی سے کھسک جاتا ہوں۔ راستے میں سوچتا ہوں کہ یہ عورت دلیپ کی وائف ہے۔ اس نے شاید شادی کرلی ہے۔ لیکن اس کی ماں کہاں ہوگی؟ اگر اس کی ماں ہوتی تو مجھے ضرور پہچان لیتی۔

اب کہیں ٹہلنے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔ محسوس ہوتا ہے یہاں آکر میں نے بھاری غلطی کی ہے۔ شہر میں اکیلے ٹہلتے ہوئے اجنبیت کا احساس شدت اختیار کرتا جارہا

ہے۔اور میرے لئے ہر چہرہ ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔

شام کی پانچ بجے ہیں۔ میں شہر کے سب سے بڑے چوراہے پر کھڑا اجبنی چہروں کی ایک بھیڑ دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ اجنبی چہروں کی اس بھیڑ میں کوئی چہرہ ایسا بھی مل جائے گا جو مجھے پہچان لے گا۔ پہلے اس چوراہے پر اتنی رونق نہیں رہا کرتی تھی۔آج تو یہاں اجبنی چہروں کا ایک لمبا سا جلوس تیر رہا ہے۔دفتر کے بابوؤں کا جھنڈ نظر آرہا ہے۔ بجھے ہوئے چہروں کے ہجوم میرے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ میں کنارے کھڑا دیکھتا ہوں۔سوچ رہا ہوں۔اس طرح دہلی میں بھی تو اداس چہروں کے اس سے بھی لمبے جھنڈ گزرا کرتے تھے۔ وہاں میں بھی تو اس جھنڈ میں شریک رہتا تھا۔لیکن وہاں کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا۔ میں ابھی یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سبزی دوکان پر ایک پہچانا سا چہرہ نظر آگیا۔ٹھیک سے پہچاننے کے لئے سبزی دوکان کے پاس جا کر سگریٹ لیتا ہوں۔سگریٹ جلاتے وقت اسے غور سے دیکھتا ہوں۔چہرہ تھوڑا بدل گیا ہے۔لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ یہ مادھو ہے۔اس لئے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہوں۔وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے۔اس کی نظروں میں اجنبیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔شاید میں نے کسی دوسرے آدمی کو مادھو سمجھ لیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں۔" آپ مادھو ہیں"۔؟ ہاں! لیکن میں نے آپ کو نہیں پہچانا اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے جواب دیا۔میں نے اُس سے لپٹتے ہوئے کہا۔"پھر ٹھیک ہے"۔لیکن مجھے لگا وہ میرے اس طرح کے اخلاق سے الجھن میں پڑ گیا ہے۔ میں نے کہا۔"سچ بتاؤ یار! کیا میں اس قدر بدل گیا ہوں کہ تمہیں بھی اپنا تعارف کراؤں۔اور کہوں کہ میں "سراج" ہوں۔اب مادھو سمجھ گیا۔اس کی آنکھوں میں چھایا ہوا اجنبیت کا بادل چھٹ گیا اور چہرہ کھل اُٹھا۔میں نے اسے ایک سگریٹ پیش کی۔اُس نے مجھے پان کھلایا۔"کب آئے ہو"؟ کہاں رہتے ہو؟ کتنی تنخواہ پاتے ہو؟ ایسے کئی سوالوں کا جواب

مجھ سے پا کر مادھو نے سبزی کا جھولا اٹھا کر کہا۔ ''کہیں جا رہے ہو کیا''؟ میں نے کہا ''نہیں'' ۔ مادھو نے پریشانیوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یار صبح سے چھوٹو کو پیچش ہو رہی ہے ابھی ڈاکٹر کے یہاں سے دوا لے کر پہنچانی ہے۔ ابھی تو تم رہو گے، پھر کبھی ملنا اطمینان سے باتیں کریں گے، ''اور وہ ہاتھ ملا کر چلا گیا''۔

اسے لگا یہ وہ شہر نہیں جہاں اس کا جنم ہوا تھا۔ یہ تو اس کے لئے انجانا انجانا سا شہر ہے۔ اجنبی شہر۔ اجنبی لوگ۔

اب میں کسی دوست سے ملنا نہیں چاہتا۔ کسی کا چھوٹو بیمار پڑا ہوا ہے۔ کسی کے بڑے لڑکے کو ز کام ہے۔ کسی کی شریمتی بیمار ہیں۔ تو کسی کے ڈیڈی، کسی کے پاس مجھ سے ملنے کے لئے وقت نہیں۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔ اس لئے چپ چاپ گھر آ کر چارپائی پر لیٹ گیا ہوں۔

ماں نے چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہا۔ ''جمنا آئی تھی بیٹا۔ تمہیں پوچھ رہی تھی'' ۔ اُف۔ یہ ماں بھی کتنی بدل گئی ہے۔ اسی کمرے میں کبھی جمنا کے بارے میں ماں نے کہا تھا۔ ''سُن ! اب چڑیل سے ملا تو میں تیرے ہی سامنے زہر کھا کر جان دے دونگی'' ۔ اور آج میں یہ کیا سُن رہا ہوں ماں کہہ رہی ہے۔ ''ذرا اس سے مل آنا۔ بے چاری کئی بار آ کر تمہارے متعلق پوچھ چکی ہے'' ۔

سوچتا ہوں، جب سب کچھ بدل گیا ہے تو کیا جمنا نہیں بدل گئی ہوگی۔ کہیں جمنا کے بھی مادھو کی طرح تین چار بچے ہوئے تو کیا ہوگا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ماں نے پھر کہا۔ ''کل تک وہاں ہو آنا بیٹا'' ۔ کل تو میں چلا جاؤں گا۔ مجھے آج ہی تک چھٹی ہے۔ یہ جھوٹ میں گھبراہٹ میں بول گیا ہوں۔ کیوں کہ میں جمنا سے ملنا نہیں چاہتا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرے کمرے میں پتا جی ماں سے کہہ رہے تھے۔ ''تو کیا وہ تیرے پاس بیٹھا رہے آخر نوکری کا معاملہ ہے۔!!!

☆☆☆

انٹلکچول کا برہنہ جسم

صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اس لئے میں اُٹھ کر باہر چلا آیا۔ میرے بعد پتا جی بھی باہر آ گئے۔ وہ غمگین دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر دروازے کی طرف لوٹ گئے۔

میرے سامنے دُکانوں کی قطاریں تھیں۔ دس پندرہ دکانوں کے بعد ایک فوٹو گرافر کا اسٹوڈیو تھا۔ کچھ ہی دور کے فاصلے پر۔ لیکن شہزادی صاحبہ وہاں تک پیدل چلنے پر راضی نہیں ہوئیں۔ وہ میری بہن ہے۔ اس لئے پتا جی کو ٹیکسی بلوانی پڑی۔ وہ کہنے لگے شادی کا دن اور شادی کی رات اپنے ساتھ مقدس لمحے لے کر آتی ہے۔ ان لمحوں میں ہر نوشاہ شہزادہ اور دُلہن شہزادی ہوتی ہے۔

میں سامنے کی دُکان پر رکھے پالش کئے ہوئے خوبصورت صندوقوں کو دیکھنے لگا جو تابوت تھے۔

لیکن ٹیکسی میرے سامنے آ کر ٹھہری تو پتا جی وہاں نہیں تھے۔ وہ اوپر انہیں جلدی سے لانے کے لئے چلے گئے تھے۔

"کیوں بھیّا! آج کوئی شادی ہے، کہیں میں کسی غلط جگہ پر تو نہیں آ گیا؟

کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ......'' ٹیکسی والے نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ بہن ۔ اس کا پتی! چاچی لوجا اور پتا جی ہنستے ہوئے باہر آرہے تھے۔ وہ لوگ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ خیر میں فوٹو گرافر کی دُکان کا راستہ جانتا ہوں۔ میں فوٹو گرافر کی دُکان پر پہنچ گیا۔ ان میں سے کوئی بھی وہاں نہیں تھا۔ شاید وہ سب فوٹو کھنچوا کر چلے گئے۔ اس خیال سے میں نے فوٹو گرافر سے ان کے بارے میں پوچھا۔ وہ میری بات سمجھ نہیں سکا۔ اس لئے مجھے ان سبھوں کا تھوڑا تھوڑا حلیہ بتانا پڑا۔ میں نے بہن ہی سے شروع کیا۔ وہ خوبصورت اور موٹی ہے۔ مقامی اسکول کی طالبہ ہے۔ اس نے شادی کے لئے ضد بھی کی تھی۔ ویسے پتا جی تو راضی ہو گئے ۔ مگر میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری چاچی جو ماں کے مرنے کے بعد میرے گھر میں ہی رہنے لگی تھیں اور جو ہمیشہ میری طرفدار رہی تھیں آج یک بیک میرے خلاف ہو گئیں۔ فوٹو گرافر نے میری ان سب باتوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس لئے میں نے صاف لفظوں میں پوچھا کہ تھوڑی دیر قبل کوئی یہاں فوٹو کھنچوانے آیا تھا۔ اس نے ''نا'' میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد ہی دیکھا کہ ٹیکسی سے بہن، اس کا پتی، پتا جی اور چاچی لوجا اتر رہے ہیں۔ وہ لوگ گرجا ہو کر آئے تھے۔ وہ سب خوش دکھائی دے رہے تھے۔ بہن نے سفید پوشاک پہن رکھی تھی اور اس کا ''وہ'' سیاہ سوٹ میں تھا۔ میں دُکان کے اندر ایک ایسی جگہ چھپ گیا تھا۔ جہاں سے میں سب کو دیکھ سکتا تھا۔ لیکن مجھے کوئی نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ فوٹو گرافر فوراً ہی اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس نے ایک بڑا سرخ پردہ کھینچا۔ تین بڑے بلب جلائے اور تین ٹانگوں پر کھڑے فوٹو کیمرہ کو آگے پیچھے کھسکا کر ٹھیک کیا۔

چاچی لوجا رومال سے آنسو پوچھنے لگیں۔ پتا جی اداس کھڑے تھے۔ میں جہاں پر کھڑا تھا وہاں سے نوشاہ اور میری بہن صاف دکھائی دے رہے تھے۔ کیونکہ وہ زمین

سے ایک میٹر اونچے چبوترے پر کھڑے تھے۔ سب خاموش تھے۔ اس خاموشی میں چاچی لوجا کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ بہن اور اس کا نوشاہ حیا کی سرخی پھاڑ کر اوپر نکل گئے تھے۔ اب صرف ان کے پیر نظر آرہے تھے۔

''آپ لوگ یہ کیا کرر ہے ہیں؟ اوپر کیوں چڑھ گئے؟ میں آپ کے جسم کے صرف نیچے والے حصے کی تصویر نہیں لوں گا۔'' یہ بہت بُری بات ہے۔ فوٹوگرافر چیخا۔

میں اپنے جگہ سے اٹھا اور انکے پاؤں پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن کامیاب نہیں ہوسکا اور اس کے بعد وہاں جو بھی کھڑے تھے وہ سب خاموشی سے دیکھنے لگے، وہ سوچنے لگے کہ کون آدمی بڑھ کر نئے نوشاہ اور اس کی دُلہن کے پیروں کو پکڑے گا جو حیا کے پردے کو چاک نہ کرسکے۔ ہر کوشش ناکام ہوگئی تو چاچی لوجا نے بہن کو شرم و حیا کی بات بتائی اور کہا لوگ کیا کہیں گے؟

انہیں اور اوپر اٹھتے دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔ میں، چاچی اور پتاجی باہر سڑک پر آگئے۔ کتنی بے شرمی کی بات ہے۔ کس قدر بے حیا ہیں۔ پتاجی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

تب ہی میں نے دیکھا کہ ان کا اوپر اٹھتا ہوا بدن سامنے تابوت کی طرف آہستہ آہستہ جھک رہا ہے۔!!!

انتظار

میری زندگی کا انصار صرف ایک منٹ اُمید اور ۲۳ گھنٹے ۵۹ منٹ نا امیدی پر ہے۔ ایک منٹ اُمید ہی مجھے بار بار اسٹیشن پر لے جاتی ہے کہ شاید تیرہ بیس کی ٹرین سے وہ آ ہی جائے، اسٹیشن ماسٹر اور سارے اسٹاف سوچ رہے ہیں کہ یہ بے چارہ روزانہ آ کر یوں ہی واپس چلا جاتا ہے۔ مجھے یہ سارے لوگ بے وقوف سمجھتے ہیں تا کہ میں یہاں آنا چھوڑ دوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ صرف بے وقوفی ہے۔ مجھے اب وہاں نہیں جانا چاہیئے وہاں جانے میں کوئی بات نہیں ہے لیکن وہاں مجھے جانا ہی پڑتا ہے، ایک منٹ کی امید اور ۲۳ گھنٹے ۵۹ منٹ کی نا امیدی پر ہی زندہ ہوں۔ کوئی اُسے میرا خبط بھی نہیں کہہ سکتا۔ مجھے اب وہاں نہیں جانا چاہیئے۔ اس سے ملتا ہی کیا ہے؟ یہی چیز مجھے مار رہی ہے۔ یہی اس سے مل رہا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو مارنا پر مجھے جانا ہی چاہیئے۔ ہاں! وہاں جانا ضروری ہے۔ آنے والی گاڑی بھی آجاتی ہے۔ تیرہ بیس کی گاڑی ٹھیک وقت پر آتی ہے۔ میں۔ میں ہمیشہ بہت نزدیک سے اُسے دیکھتا ہوں، بہت ہی نزدیک سے۔!

جیسے ہی میں نکلتا ہوں، سگنل کی جھنڈی لئے ہوئے وہ آدمی سمجھ جاتا ہے۔ وہ اپنی جھونپڑی سے نکلتا ہے۔ جبکہ گھنٹی کی آواز مجھے پہلے ہی سنائی دے جاتی ہے۔ تب میں بھی باہر نکل کر اُس کے پاس جاتا ہوں، وہ مجھے جانتا ہے۔ اس کا چہرہ اُداس سا ہے۔ کچھ گھبرایا ہوا ہے۔ ہاں! وہ سگنل کی جھنڈی والا آدمی خوف زدہ ہے۔ وہ آدمی سوچتا رہتا ہے کہ کسی دن میں اُس پر حملہ کر دونگا۔ میں اُسے جان سے مار دونگا۔ اور ریل کی پٹری پر

ڈال دونگا اور تیرہ بیس والی گاڑی اُس کے اوپر سے گذر جائے گی۔ کیونکہ اُس جھنڈی والے آدمی کو مجھ پر یقین نہیں ہے میں نہیں جانتا وہ معصوم ہونے کا فریب دے رہا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ اُس کا خیال ہو، ٹھیک ہے۔ میں مان لیتا ہوں اُس کا ڈر صحیح ہے۔ اس کے خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ موجود ہے۔ میں کسی دن اچانک اس کی ہی جھنڈی کے ڈنڈے سے اُس پر حملہ کر دونگا۔ میں بھی اس پر یقین نہیں کرتا۔ شاید ان لوگوں سے ملا ہوا ہے۔ اس کے پاس جھونپڑی میں ٹیلفون بھی تو ہے۔ اُسے صرف نمبر ڈائل کرنے کی دیر ہے وہ اُن سے بات کر سکتا ہے۔ بُلا سکتا ہے ریلوے کے لوگوں میں تو ایک دوسرے سے سیدھے فون پر بات ہوتی ہے۔ شاید وہ ریسور اُٹھا کر لائن سے دو اسٹیشن پہلے کے لوگوں سے کہے گا، اُسے اتار لو، گرفتار کرلو۔ اُس کو آنے مت دو، ایسے ہی نہ جانے کیا۔ کیا......! ہاں! وہی لڑکی بھورے بالوں والی، جس نے سبز بلاؤز اور ساڑی پہن رکھی ہے۔ ہاں اُسی سے جس نے اُس لڑکی کو پکڑ رکھا ہے۔ وہ ہنستا ہے۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اُسے ہنسنے دو اُس لڑکی کو پکڑے رہنے دو، وہ ٹیلی فون پکڑے ہوئے بھی ہنستا رہتا ہے۔ پھر وہ باہر آتا ہے۔ اپنا معصوم چہرہ لئے ہوئے جب وہ مجھے اپنی طرف کڑی نگاہ سے دیکھتا ہے تو ہمیشہ کی طرح بغیر پوچھے ہی مجھ سے کہنے لگتا ہے۔ حضور! دیری کا کوئی خبر نہیں ہے؟ آج بھی ٹرین ٹھیک وقت پر آ رہی ہے۔ میں پاگل سا ہوتا جا رہا ہوں۔ لگتا نہیں کبھی میں اُس پر یقین کر پاؤں گا۔ اُس کی پیٹھ ہمیشہ میری طرف ہی رہتی ہے۔

میں جانتا ہوں وہ آنا چاہتی ہے۔ اُس نے مجھے لکھا تھا۔ ''میں تمہیں چاہتی ہوں، اور میں تیرہ بیس کی گاڑی سے آ رہی ہوں۔ میں وہاں تیرہ بیس میں پہنچ جاؤں گی''۔ یہ اُس نے تین ماہ قبل لکھا تھا۔ ٹھیک تین ماہ چار دن قبل پر اُسے زبردستی ٹھہرالیا گیا ہے۔ وہ لوگ نہیں چاہتے کہ وہ میرے پاس آئے، وہ سب میرے خلاف ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ایک منٹ اُمید سے زیادہ کچھ ہو۔

میرا انتظار اب ختم ہو گیا ہے۔ آج مجھے اگر وہ مل جائے تو آخری یاد بن جائے
گی، میں پاگل پن میں تین ماہ چار دن سے اپنی ہی چربی کھا رہا ہوں، یا پھر میری چربی
مجھے کھائے جا رہی ہے۔ ہر چیز چلی گئی۔ یہاں تک کہ میز پوش بھی نہیں رہا۔ انہوں نے
بہت ہی مشکلیں پیدا کر دی ہیں۔ وہ گروپ تو اب بھی ایک ہی جگہ بیٹھتا ہے جیسے سکھ اور
خوشی انہیں کی جاگیر ہے۔ سب کچھ ان کے ہی پاس ہے۔ بس وہ دن بھر میں ایک منٹ
کی اُمید ہی دے سکتے ہیں۔ ۲۳ گھنٹے ۵۹ منٹ تک اُن سب چیزوں سے بچے رہیں۔
میں کس طرح اپنا وقت گذار رہا ہوں، وہ مجھ سے ہمدردی بھی ظاہر نہیں کر سکتے، ان سب
چیزوں کی انہیں ضرورت بھی نہیں ہے۔ پھر بھی وہ سب کچھ اپنے ہی پاس کیوں رکھتے
ہیں؟ کیا روپیہ ہی سب کچھ ہے؟ وہ مجھے پانے کے لئے کچھ کیوں نہیں دیتے؟ وہ
میرے لئے آرام کو بھی مہنگا کیوں بنا دیتے ہیں۔ وہ مجھے ہُک پر لٹکائے رکھنا چاہتے
ہیں۔

مجھے کم از کم اپنے لئے ایماندار ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔ جب شروع میں
ہی لوگ ٹرین سے اُترے تھے۔ اور ان میں وہ نہیں تھی۔ تبھی مجھے امید چھوڑ دینی چاہیئے
تھی۔ خوش فہمی جلدی ہی ختم ہو جانی چاہیئے تھی۔ پر یہ کام دیر سے ہوا ہے۔ آدمی کو ایمانداری
سے سامنا کرنا چاہیئے۔ ٹرین جب دکھائی پڑتی ہے تو خوشیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن کل
ایسا نہیں ہوا۔ ٹرین کے ٹھہرتے ہی امید کا قلعہ مسمار ہو گیا۔ جیسے ہی ٹرین ٹھہری
دروازے کھولے، لوگ اُترے لیکن وہ ان لوگوں میں نہیں تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ کیا ابھی
۳۰ سیکنڈ باقی ہے؟ مجھ میں ایماندار ہونے کی طاقت نہیں ہے۔ صرف ایک سیکنڈ اور پھر
۲۳ گھنٹے ۵۹ منٹ نا امیدی کے ہے۔ یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی اختتام تو ہونا چاہئے ہر
ذی روح کو زندہ رہنے کے لئے امید کے لمحوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کم از کم دن بھر
میں انہیں ایک سیکنڈ تو چاہیئے۔ ان لوگوں کو کم سے کم یہ سیکنڈ مجھ سے نہیں چھیننا چاہیئے۔ وہ

تو میری اُمید کے لمحوں کو اور بھی کم کر رہے ہیں۔

اب صرف میرے پاس والد صاحب کی ایک گھڑی بچ رہی ہے اس سے کچھ دن تو گزارا چل سکتا ہے۔ کوئی نہیں بتا سکتا اس سے کتنا مل جائے گا۔ اس سے جو کچھ ملے گا وہ جانے کے کرائے کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔ شائد کوئی ایسا شریف کنڈکٹر نکل آئے جو گھڑی لے کر واپسی کے کرائے کیلئے بھی روپے دے۔ لیکن مجھے دوبار کی واپسی کے کرائے کی ضرورت ہوگی۔ ساڑھے بارہ بج گئے۔ اب مجھے تیار ہو جانا چاہیئے۔ میرے پاس جو کچھ بھی تھا وہ میں نے ٹکٹ کے لئے دیدیا۔ یہاں تک کے میرے پاس پورے راستے کا ٹکٹ ہے۔ ''ایک گھڑی''۔ چلاّ رہا ہوں۔ ایک سو میں یہ گھڑی۔ ایک بہترین گھڑی جو کہیں سے بھی ٹوٹی پھوٹی نہیں ہے۔ میرے والد صاحب کی گھڑی۔ لوگ سوچتے ہیں میں مجرم ہوں۔ اب گاڑی آنے میں چند منٹ ہی رہ گئے ہیں۔ میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔ کیا میں آج کی گاڑی نہیں دیکھ پاؤنگا۔ ایسا نہ ہو آج کی گاڑی سے آجائے؟

پہلا آدمی جو مجھے ملتا ہے۔ اس سے میں کہتا ہوں'' مجھے اس گھڑی کے بدلے ایک سو روپے دو۔ وہ زیادہ ہی دیتا ہے۔ ٹرین آنے سے آدھ منٹ پہلے ہی سیڑھیوں پر ہوتا ہوں۔ میں نے سگنل مین سے اپنے آپ کو دور رکھا۔ وہ بھیڑ کے درمیان میں کھڑا تھا اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ جاتی ہے۔ وہ چلاتا ہے۔ پھر وہ مجھے پکڑنے کے لئے اپنے گروپ کے ساتھیوں کو بتاتا ہے۔ وہ مجھے پکڑ لینے کا اشارہ کرتا ہے۔ وہ اپنی جھونپڑی سے نکل کر میری طرف بڑھتے ہیں۔ وہ مجھے پکڑنا چاہتے ہیں۔ میں اُن پر ہنستا ہوں اس لئے ہنستا ہوں کہ ٹرین آگئی ہے۔ اور جب تک وہ لوگ مجھے پکڑنے آئیں گے، وہ میری بانہوں میں ہوگی۔!!!

☆☆☆

قصہ البم کا

جوں ہی ٹرین کھلی۔

میں ٹرین کی مخالف سمت میں دوڑنے لگا۔ ہر طرف پھیلی ہوئی دور دور تک ریل کی پٹریاں تھیں۔ اور ہر طرف پر ہول سناٹا۔ خاموش چپ چاپ بہتی ہوئی ہوائیں۔ جن میں نہ جانے کتنی چتاؤں کے جلنے کی بو شامل تھی اور نہ جانے کتنے غم کے ماروں کی آہیں اور نہ جانے کتنے ہوس پرستوں کی ہوس پرستی کا لمس، میں ان سب کو پرے ڈھکیلتا ہوا آگے بڑھا اور مڑ کر نفرت سے اس کے منھ پر تھوک دیا۔

اِسے میری نفرت اور پاگل پن پر ہنسی آگئی۔

مجھے بھی غصہ آگیا اور جب میں نے اسے پکڑنے کے لئے قدم بڑھایا تو وہ میری گرفت سے بہت دور جا چکا تھا۔ مگر دور سے بھی اس کے قہقہے کی آواز بڑی صاف سنائی دے رہی تھی، مجھے اپنی بے بسی پر بڑا ترس آیا۔ اسی درمیان میں نے پھر ایک جست لگائی اور اپنی رفتار کو اور تیز کر دیا۔ اور میں بہت جلد اپنے گھر کے جانب مڑنے والے چوراہے پر جہاں ایک بہت بڑا پیپل کا درخت شاید صدیوں سے زمانے اور انسانوں کے عروج و زوال کو اپنے دامن میں چھپائے کھڑا مسکراتا رہا ہے۔ پہنچ گیا۔ اور ٹھیک اُسی کے زیر سایہ پڑا بھیک مانگا جس کے ہاتھ پیر کٹے ہیں۔ ان پر ڈھیر ساری مکھیاں بھنبھناتی رہی

ہیں۔ جسے وہ اپنے کٹے ہاتھوں کو بار بار زمین پر پٹک کر اڑانے کی ناکام کوشش کرتا رہا ہے۔ اسے میں مسلسل کئی سالوں سے اسی طرح دیکھتا آ رہا ہوں یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ یہ بھی ایک سوال ہے؟ مگر کس کو اتنی فرصت ہے کہ ان سوالوں کے پیچ و خم میں الجھے، البتہ میں نے کبھی کبھی رات میں ایک بوڑھی عورت کو کھانا کھلاتے دیکھا ہے، جو شکل و شباہت سے ستم زدہ معلوم پڑتی ہے۔ اس سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ کون جانے! کون دریافت کرے۔

میں وہاں سے پلٹا اس لئے کہ مجھ کو یک بیک محسوس ہوا کہ میرے پاؤں میں بھاری زنجیریں بندھ گئیں ہیں۔ اور جب ان زنجیروں کو روندتا ہوا آگے کی طرف بڑھا تو دیکھا بہت سارے لوگ ایک سمت بھاگے جا رہے ہیں...... میں بھی ان کے ساتھ دوڑنے لگا۔ دوڑتے دوڑتے جب تھکاوٹ کا احساس ہوا تو مڑ کر دیکھا کہ لوگ دوڑ ہی رہے ہیں یا صرف میں اتنی دور تک دوڑتا چلا آیا ہوں، تب مجھے غلطی کا احساس ہوا اور پھر میں خوف سے کانپنے لگا۔ نہ جانے سب کے سب کہاں رُک گئے تھے۔ صرف میں اکیلا اتنی دور تک چلا آیا تھا۔ لیکن یہاں میرا گھر تو نہیں تھا۔ میں کسی غلط جگہ پر آ گیا تھا۔ میں وہاں سے پلٹ پڑا اور راستے میں پڑے ایک پتھر سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا۔ میں اپنے زخمی جسم اور داغ دار روح کو سمیٹے اپنے مکان والی گلی کے موڑ پر پہنچا تو ہر طرف بکھرے ہوئے عجیب اور ہیبت ناک سناٹوں نے میرا استقبال کیا۔ میں سہم گیا۔ اور چپکے سے اپنے مکان میں داخل ہو گیا۔ آج پہلی مرتبہ مجھے اپنے گھر میں اجنبیت کا شدید احساس ہوا، بام و در سب اجنبی۔ اجنبی........! اگرچہ سورج اپنے مقام سے کچھ نیچے ہی کھسک آیا تھا۔ مگر میرا گھر ایک گہری تاریکی میں دم توڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں یہ بھی بھول گیا کہ میں کس لئے یہاں آیا ہوں؟

چپ چاپ بڑی دیر تک آنگن میں کھڑا اپنے متحرک جسم سے آشنا مگر اب غیر

آشنا ماحول کو دیکھتا رہا۔ کافی وقت گزر جانے کے بعد بھی جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو واپس جانے کو مڑا، ٹھیک اُسی وقت میرے سر پر ایک چھپکلی گری۔ اور پھر میرے سر پر سے ہوتی ہوئی زمین پر رینگنے لگی، مجھے بڑے گھناؤنے پن کا احساس ہوا...... اور تب مجھے یک بہ یک یاد آ گیا کہ میں یہاں صرف ایک البم کے لئے آیا تھا۔ البم جس میں میرے پرکھوں سے لیکر آج تک کی کہانی ہے۔ میں دھیرے دھیرے چلتا اس کمرے کی طرف بڑھا جس میں البم رکھا تھا۔ وہ البم اب میرے خاندان کا واحد اثاثہ ہے۔ بقیہ تمام اثاثے کو چھوڑ کر میں آگے جا ہی چکا ہوں۔ یہ میرے دادا جان کی تصویر ہے۔ مگر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اس لئے کہ اس پر خون کا ایک تازہ دھبہ نمایاں تھا۔ میں تمام تصویروں پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے ورق الٹتا چلا گیا۔ تمام تصویروں پر بے شمار خون کے دھبّے اور جا بہ جا خون کی چھینٹیں موجود تھیں۔ اس طرح اس البم کی تمام تصویروں کے داغدار ہو جانے پر مجھے بہت افسوس ہوا۔ اس لئے کہ اس البم کو میں نے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز رکھا تھا۔ لاکھ حالات بدلے، بھوکے مرے مگر البم کی تصویروں کو سنوارنے اور سجانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی، مجھے یاد ہے کہ میں نے جاؔی کو صرف اس لئے پیٹا تھا کہ اس نے میرے ''پرکھوں'' کی تصویروں پر ہلکا سا کالک کا دھبہ لگانے کی بھول کی تھی۔ مگر آج یہ کس ظالم نے میرے زندگی بھر کی امانت کو اس طرح ملیا میٹ کر دیا ہے۔ مگر میں تو جانتا ہوں کہ اس البم کا دشمن کون ہے؟ اور کس نے ان تصویروں کو داغدار بنایا ہے۔ مگر میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ یہ ایک بے بسی ہے۔ جو سمندر میں رہنے کی سزا ہے؟ اس لئے کہ چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو بڑی مچھلیوں کا لقمہ بننا ہی پڑتا ہے۔ اور پھر میرے سوچ کا دائرہ تنگ ہونے لگا ہے اور سورج اپنی جگہ پر واپس چلا جاتا ہے۔ اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ کیوں نا میں اپنے اس البم کو جسے اب تک زمانے کے مختلف دھبوں سے بچاتا آیا ہوں، ان تمام لوگوں پہ پھینک دوں جن کے سروں پر البم کی چھپکلی سوار

ہے۔ مگر اس البم میں چپکی ہوئی میرے بزرگوں کی تصویریں جن سے منتشر ہوتی ہوئی روشن شعاعیں مجھے اپنے اس ارادوں پر عمل کرنے سے روک رہی ہیں۔ جن کی ایک تاریخ ہے، ایک یادگار ماضی ہے، اسی ماضی کی بات ہے کہ ایک دن ڈوبتے ہوئے سورج نے کہا۔ اس دنیا میں کون ہے جو میرے بعد اس تاریکی سے لڑے اور چاروں طرف روشنی بکھیر دے، بہت دیر تک سناٹا رہا، اخر کار ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ آگے بڑھا اور اس نے سورج سے وعدہ کیا کہ اپنی بساط بھر کوشش کرے گا اور اسی بساط کے نیچے میں البم کی تمام تصویروں نے یکے بعد دیگرے چراغ میں تیل کے بجائے اپنا اپنا خون دیا۔ اس لئے کہ یہ عجیب ساخت کا چراغ تھا۔ جس میں بجائے تیل کے خون ہی جلا کرتا تھا۔ اسی طرح چراغ بہت دنوں تک روشن رہا۔ اس چراغ کی روشنی سے تاریخ کے کئی ابواب روشن ہو گئے اور ساٹھ سال گذر گئے، مگر آج ان تمام تصویروں پر خون کے دھبے، خون کی بے شمار چھینٹیں نوحہ کناں ہیں...... اور میں بڑی شدت سے سوچ رہا ہوں کہ ان پرانی بوسیدہ تصویروں سے نکلتی ہوئی تیز شعائیں میری آنکھوں کو تو روشنی بخشتی رہی ہیں مگر کیا ان میں اتنی قوت بھی نہیں تھی کہ ان خون کے دھبّے لگانے والوں سے اتنا ہی پوچھ سکتیں کہ میرے خون کی قیمت کیا یہی ہے کہ تم لوگ میری تصویروں کو داغدار کر دو، لیکن ......۔۔۔!!!

☆☆☆

اپی ٹاف

تقریباً ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔
دن بھر کی تھکان پورے وجود پر حاوی ہوتی جارہی تھی اور میں اب بستر کی گود میں چلا جانا ہی چاہتا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔
'اس وقت کون ہوسکتا ہے۔''؟میں سوچتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول دیا۔
''روی تم''؟روی کو اتنی رات گئے دیکھ کر میں حیرت زدہ سا رہ گیا۔
روی خاموش کھڑا رہا میں نے بالکونی کی بتی جلادی، روی روشنی میں نہا گیا۔
اور میں نے دیکھا کہ روی خاصا پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آرہا ہے۔
''کیا بات ہے روی''؟تم بولتے کیوں نہیں؟ اتنے پریشان کیوں نظر آرہے ہو''؟
روی نے مجھے پریشان، اداس اور خالی نگاہوں سے دیکھا اور انتہائی پژمردہ آواز میں بولا۔لوسی،لوسی......''اور پھر چپ ہوگیا۔
''کیا ہوا لوسی کو......بتاؤ روی، کیا ہوا''۔؟میں بے ساختہ چیخ اُٹھا۔
روی کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے کھلے اور پھر ایک دوسرے سے آن ملے،

اب مجھ میں برداشت کی تاب نہ تھی، میں نے اُس کے دونوں کندھے پکڑ کر جھنجھوڑ کر رکھ دیئے۔ ''بولو روی بولو! میں شاید اپنے ہوش وحواس میں نہ تھا۔

روی نے آہستہ سے میرے دونوں ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹائے، ٹھنڈی سانس لیکر رومال سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا، اب وہ اپنے آپ پر قابو پا چکا تھا۔

'امیت! لوسی ختم ہوگئی''۔ اُس کی آواز میں سمندر کا اوپری ٹھہراؤ اور خزاں کی بھری دوپہر کا سناٹا بول رہا تھا۔

''روی تم ہوش میں تو ہو۔؟ تم کیا کہہ رہے ہو روی؟ میں محسوس کیا کہ میری آواز انتہائی غم وغصہ سے بھری ہوئی تھی، روی نے ہمدردانہ انداز میں میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا۔

''ہاں امیت! میں پوری طرح ہوش میں ہوں، لوسی ایک تیز رفتار کار کے نیچے آکر ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو چکی ہے''۔ اور تب میرے اندر جانے کیسا جوار بھاٹا اُٹھا، جانے دکھ کا کیسا سمندر پورن ماشی کے چاند سے نبرد آزما ہونے لگا میں نے جذبات چھپانے کے لئے آسمان کی طرف نگاہ کی، مگر آسمان سیاہ تھا، میرے من پر اتنا بوجھ تھا کہ میں چاہ کر بھی نارمل نہیں ہو پا رہا تھا۔ میں چیخ اُٹھا...... ''نہیں لوسی نہیں مر سکتی...... وہ کبھی نہیں مر سکتی''۔

روی نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، شاید وہ میرے دکھ کا اندازہ کر رہا تھا اُس نے آہستہ سے اور بڑی ہمت سے سمجھایا۔ ''امیت! پاگل مت بنو، یہ وقت رونے کا نہیں ہے لوسی کا غم تو ہمیشہ جگمگاتا رہے گا اس وقت ہمیں اُس کے گھر چلنا چاہیئے''۔

میں نے روی کے طرف دیکھا۔ یہ روی تھا۔ نہیں، یہ کوئی اور تھا روی تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی دل کو خوش کرنے والی بات سناتا، اس کی اس ادا پر میں نے اُسے ''پیغامبر

مسرت'' کا خطاب دیا تھا مگر آج یہ بات جھوٹی ثابت ہو چکی تھی، روّی نے مجھے دھوکا دیا۔ آج اُس نے مجھے میرے دل کی گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں تڑپنے اور پھڑ پھڑانے کا سامان مہیا کیا تھا۔

''مگر روّی کیا کر سکتا ہے''؟ میرے اندر ہی اندر پھر ایک سوال اُٹھا، اور اس سوال کا میرے پاس جواب نہیں تھا۔

لوّسی کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ لوّسی کی ماں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہیسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہو، وہ دیواروں سے اپنا سر ٹکرا رہی تھی، اس کو دیکھ کر تو میں اپنا بھی غم بھول گیا اور اپنے میں اتنی ہمت بھی نہ پیدا کر سکا کہ اُس کے نزدیک جا کر اُسے سمجھا سکوں...... میں آہستہ سے اُس طرف بڑھ گیا، جدھر لوّسی کا مردہ جسم پڑا ہوا تھا۔ یہ ایک اور دل دہلا دینے والا منظر تھا۔ وہ خوبصورت، سادہ، سبک اور تیکھے نقوش والی لوّسی جو مجھ سے محبت کرتی تھی وہ وہاں نہیں تھی۔ وہاں تو ایک مسخ چہرہ پڑا ہوا تھا جس کا ایک ایک حصہ کار سے ٹکرا کر چور چور ہو چکا تھا۔

میں آنسوؤں میں نہایا اور آہوں میں جلا اور طاقت و جبروت والے خدا کے خوف سے اندر ہی اندر لرزتا رہا جس نے شاید چشم زدن میں یہ فیصلہ لیا کہ اس ترو تازہ جوان، خوب رو، تیز و طرار، کومل، شیتل اور مدھر لڑکی کے متحرک فعال اور پر کشش جسم کو اب خاموش ہو جانا ہے۔

لوّسی خاموش...... نہیں، مردہ میرے سامنے پڑی رہی، اور مجھے بہت ساری باتیں، خواب، امیدیں، آرزوئیں، مسرتیں، لمحے، یادیں، پریشان کرتی رہیں جو ہم دونوں کا مشترک سرمایہ تھیں۔ آنسوؤں کے چند قطرے پھر بے قرار ہو کر نکلے اور لوّسی کے جسم پر پڑی سفید چادر میں حل گئے۔

لوّسی کے اختتام پر لوّسی کی ابتدا یاد آ گئی، وہ کالج میں مجھ سے دو سال جونیئر تھی،

اس کی صاف گوئی اور نرم رویئے نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا، پھر ایک مرتبہ وہ میرے گھر بھی آئی اور اس طرح آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے، گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ ایک عجیب احساس نے سر اُٹھایا، میں نے محسوس کیا کہ آپ ہی آپ میرے دل میں اُس کی محبت کا بیج جڑ پکڑ چکا ہے، پھر اس بیج کا انکر پھوٹا، پھر ننھا منا پودا نکلا اور دیکھتے دیکھتے وہ ایک تناور درخت بن گیا مگر میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں انتہائی شرمیلا ہونے کے سبب کبھی کھل کر اس کے سامنے اپنے اِس جذبے کا اظہار نہ کر سکا۔ صرف میرے دل کے ہر کونے میں اس کی محبت کا چراغ جلتا رہا اور میرے خانہ دل پر اسکی چاہت کی پھوار پڑتی رہی مگر یہ بارش بے آواز تھی، اور محبت خاموش تھی۔

لوسی اپنے امتحان کی تیاریوں کے سلسلے میں اکثر، بیشتر میرے یہاں آتی رہتی اور میں کچھ کہے بغیر نہایت، ذمہ داری، ایمانداری اور لگن کے ساتھ اس کو پڑھاتا رہا۔ ایسی ہی ایک شام لوسی نے اچانک میری طرف نگاہ اُٹھائی، مسکراتی ہوئی آدھی گویا آدھی ساکت آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں، میں فطری طور پر ایسی صورت حال سے گریز کا عادی ہونے کے سبب گڑبڑا گیا پر اُن آنکھوں کو کیا کرتا جو مسلسل مسکرا رہی تھیں، اور مسلسل مجھے دیکھ رہی تھی...... اچانک دیکھتے دیکھتے لوسی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آہستہ سے بولی۔

''امیت! تم سے الگ ہوتی ہوں تو تم مجھے بہت یاد آتے ہو...... مجھے تم ......''!۔

جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ اُٹھی اور تیزی کے ساتھ دروازے سے باہر نکل گئی۔ اور میں تنہا رہ گیا میرے اردگرد ایک طوفان سر مارتا رہا، پتہ نہیں اس کیفیت کا کیا نام ہے جب خوشی اور غم دونوں بے نام ہو جائیں۔ جب اندر اندر تو خوشیوں کا احساس موجزن ہو اور آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جائیں میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے،

رات بھر میں بستر پر کروٹ پہ کروٹ بدلتا رہا اور ہزار کوشش کے باوجود نیند نہ آسکی۔

دوسری صبح کمرے میں بیٹھا تھا کہ لوسی آ گئی اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی میں نے سر اُٹھایا اُس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں پیوست ہوتی جا رہی تھی، میں ایک مرتبہ فطری حجاب کی دھند میں گھرا مگر فوراً ہی اپنے کو سنبھال لیا اور آہستہ سے کہا۔ ''لوسی! کل بات ادھوری رہ گئی تھی''۔!

وہ آہستہ سے مسکرائی اور جذبات سے بوجھل آواز میں بولی۔ ''ایسی باتیں ادھوری ہی چھوڑی جاتی ہیں امیت۔''

''پلیز! میری خاطر مکمل کر دو، ایک مرتبہ پوری بات کہہ دو''۔

لوسی تھوڑی دیر خاموش رہی پھر بہت دھیرے سے بولی۔ ''ہاں! امیت مجھے تم سے محبت ہے''۔!

میرے اندر ہی اندر خوشی کا ایک سیل سا اُٹھا اور میں اُس میں بہہ گیا، میں شاید اپنے آپ میں تھا ہی نہیں، پھر مجھے خود میری آواز سنائی دی۔ ''اب تم میری زندگی کا مقصد اور میری منزل ہو لوسی''۔

پھر یوں ہوا کہ اس سیل میں ہم دونوں بیک وقت بہے اور پھر کچھ یاد نہ رہا، بس ہم دونوں ایک دوسرے کو بھینچے ہوئے رقص کرتے رہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے محبوب تھے، امتیاز من وتو مٹ چکا تھا، اور اس لمحے میں میرے اور لوسی کے علاوہ اس پوری کائنات میں کچھ نہ تھا، میں نے لوسی کے لئے ایک نظم کہی۔

''اس دھرتی پر دو ہی کتھا
میں اور تم............''

پھر دوسری نظم، تیسری نظم میں لوسی کو دیکھتا رہا اور شعر کہتا رہا، لوسی مجھے دیکھتی رہی اور شعر سنتی رہی دن پر دن اس طرح گزرتے چلے جا رہے تھے کہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ

صبحیں کب طلوع ہوتی تھیں اور رات کیسے دروازوں پر آن دھمکتی تھی...... ایسے ہی ایک لمحے میں لوسی کہنے لگی۔ ''امیت وعدہ کرو کہ میں جب مرجاؤں تو تم میری قبر پر لگانے کے لئے ایک اپی ٹاف Epitaph لکھو گے''۔ میں نے اُس کی اس بات پر اُسے خبطی، پاگل اپنے چاہنے والوں کو رُلانے والے جیسے القاب سے نوازا اور اسکی بات کو نان سنس قرار دیتے ہوئے ہوا میں اُڑا دیا۔

مگر آج وہی بات سچ ثابت ہو چکی تھی اور میں اُس کی لاش کے پاس بیٹھا اُس کے ساتھ گذری ہزاروں یادوں اور ساعتوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، ساری رات یہ ساعتیں جھلملاتی رہیں اور لوسی میرے سامنے اپنے پسندیدہ سفید لباس میں ہونٹوں پر نرم نرم مسکراہٹ لئے لیٹی رہی، وہ ابدی نیند سو رہی تھی اور میں جاگ رہا تھا۔ اور اُسے دیکھ رہا تھا، اچانک میری نگاہ اپنی گردن میں پڑے چاندی کے اُس لاکٹ پر پڑی جو اُس نے مجھے دیا تھا۔ یہ محبت کا تحفہ اس کی طرف سے ملا تھا۔ میں نے وہ لاکٹ اتارا اور اس کی گردن میں پہنا دیا۔ میں اس سے زیادہ اس کی محبت کا اور کیا احترام کر سکتا تھا۔

اور یوں ساری رات بیت گئی اور وہ صبح آئی جو اُس سے جدائی کی آخری صبح تھی، اس کا جنازہ اُٹھا۔ سب چلے۔ میں بھی چلا۔ لوگ زیرِ لب دعائیں پڑھ رہے تھے۔ لیکن مجھے کوئی دعا یاد نہیں آ رہی تھی۔ اگر یاد بھی آتی تب بھی میں پڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔

ع ''دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ''

میں لوسی کے جنازے کا ایک خاموش تماشائی شریک تھا۔ مگر بہت دیر تک میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اس سے پہلے کہ اُسے قبر میں لٹایا جائے میں نے تابوت پکڑ لیا اور آنسوؤں سے تربتر ایک بوسہ آپ ہی آپ اس تابوت پر ثبت ہو گیا، میری لوسی تابوت میں تھی، میں نے تابوت کا نہیں، لوسی کا بوسہ لیا تھا۔

اور پھر لوسی مجھ سے جدا ہو گئی، اسکی قبر بند کر دی گئی تو مجھے اُس کے الفاظ یاد

آ ئے۔ ''وعدہ کرو کہ جب میں مر جاؤں تو تم میری قبر پر لگانے کیلئے ایک اپی ٹاف Epitaph لکھو گے''۔ اور مجھے ایک ایسے وعدے کی تکمیل کرنی پڑی جو میں نے کیا ہی نہیں تھا۔

آنسو میری آنکھوں میں جھلملاتے رہتے ہیں، دل اس کی یادوں سے روشن پُر نور--- اور افسردہ رہتا ہے اور اسکی قبر پر میرا لکھا ہوا کتبہ میری کیفیت کا تھوڑا بہت اظہار کرتا رہتا ہے۔

''پل بھر کی یہ جھپکی/ گہری نیند ہی بن جائے/ لیکن وہ تمہاری زندہ دلی
ہنستی ہوئی آنکھیں محبت سے بھری/ سونے کی نہیں جاناں/ مرنے کی نہیں یارو
جسم فانی ہے تو کیا/ روح تو سائے کی طرح/ اک عمر کی ساتھی ہے/ یادوں کی
جلاوطنی کسی شخص کے بس میں ہے
اور میرا دکھ زندہ ہے...... اور تا عمر زندہ رہے گا۔''

کہ لوسی میری زندگی کے صحراؤں سے نکل کر بہشت کے باغوں کے طرف اتنی آہستگی سے چلی گئی کہ مجھے خبر تک نہ ہوئی۔!!!

☆☆☆

اجنبی شہر میں ایک اِنسان

چلتے چلتے وہ بس اسٹاپ کے ایک شیڈ کے نیچے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ دور تک کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ سون برج کے چوراہے پر آکر ملتی ہوئی تینوں سڑکیں جیٹھ کی آتشی دوپہر میں بالکل سنسان تھیں۔ اس نے فیصلہ کیا تھوڑا آرام کر لینے کے بعد تلاش میں چلنا اچھا ہوگا۔ دونوں ٹانگیں جوڑ کر۔ اس نے گھٹنے میں اپنا سر چھپا لیا، تیز لُو تھی۔ لیکن وہ بے فکر آرام سے بیٹھا رہا۔ یک بہ یک ایک موٹر کار زناٹے سے ہارن بجاتی ہوئی گزر گئی۔ اس کے خیالات منتشر ہو گئے۔ اس نے چاروں طرف پھر نظر دوڑائی۔ دُور ایک راستے سے ایک موٹر سائیکل اپنی پوری رفتار سے گزر رہی تھی اور ایک اپٹوڈیٹ جوڑا چوراہے کی دوسری جانب سے سڑک پار کرتا ہوا بس اسٹاپ کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ وہ اس اپٹوڈیٹ جوڑے کو غور سے دیکھنے لگا۔ ایسا محسوس ہُوا کہ جہاں وہ بیٹھا تھا وہاں سے اس جوڑے تک ایک سیڑھی بن گئی اور اس سیڑھی پر وہ جلدی جلدی چڑھنے لگا۔ جوڑا نزدیک آ گیا اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ یک بیک وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ کیونکہ وہ حسین جوڑا بس اسٹاپ کے شیڈ کے نیچے بالکل اس کی نظروں کے سامنے کھڑا تھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں اپنے لئے حقارت اور غصہ دیکھ کر وہ اور بھی شیڈ کے آخری حصے کی دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس کا دل دھڑک رہا تھا اسی طرح۔

کل بھی وہ اسی طرح ایک بس اسٹاپ کے شیڈ میں دھوپ سے بچنے کے لئے کھڑا ہو گیا تھا۔ دو چار لوگ اور کھڑے تھے۔ انہوں نے بھی اس حسین جوڑے کی طرح اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ اچانک ٹیڈی لباس میں ملبوس پندرہ بیس لڑکیاں بس اسٹاپ پر ہنستے قہقہے لگاتی آ پہنچیں۔ لڑکیاں جب بس اسٹاپ پر کھڑی ہو رہی تھیں اس وقت پیچھے والی ایک لڑکی اس سے ٹکرا گئی۔ ٹکرانے والی لڑکی چیخ مار کر اس سے دور ہو گئی تھی۔ جیسے اس کے سامنے کوئی زہریلا سانپ آ گیا ہو اور پھر وہ خوف کے مارے وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ اسی وقت ایک سیٹی کے فوراً بعد آواز صاف سنائی دی۔ "ابے. ابے کہاں جانا ہے؟ رک جا" اشارہ اسی کی طرف تھا۔ وہ خوف زدہ ہو کر رک گیا۔ ایک لال پگڑی والا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اور بھی خوف زدہ ہوا اور کانپنے لگا۔ جانے کیا ہو؟

"اے بنگڑو! باپ کی سڑک سمجھ رکھی ہے۔ بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ دیکھتا نہیں لال بتی جل گئی ہے۔ اندھا ہے کیا، چل ہٹ پیچھے۔"

وہ پیچھے کھسک گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بس ایک بات پر رہ رہ کر اسے حیرت ہو رہی تھی۔ وہ لال پگڑی والا اس کا نام کیسے جانتا تھا۔ اس کے گاؤں والے اسے بنگڑو ہی کہا کرتے تھے۔ یہ آدمی بھی...... اس اجنبی شہر میں اس لال پگڑی والے کے منہ سے اپنا نام سُن کر اس کی خشک ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ آئی تھی۔

آج بھی بس اسٹاپ کے نیچے وہ اس جوڑے سے دور کھڑا تھا۔ اس کی ترچھی نظریں اس حسین جوڑے کی حرکت کو چپکے چپکے دیکھ رہی تھیں۔ عورت کا ہاتھ مرد کے ہاتھوں میں تھا۔ آنکھیں مرد کی آنکھوں میں تھیں۔ عورت کہہ رہی تھی۔

"تین بسیں گزر گئی ہیں۔ چوتھی بس سے میں ضرور چلی جاؤں گی۔ دیکھو بہت دیر ہو گئی ہے۔ پلیز!" اور عورت کی گھومتی ہوئی آنکھیں اس کی آنکھوں سے ٹکرا گئی تھیں۔ "ارے

ادھر کیا دیکھ رہا......؟ اس سے پہلے کہ عورت کچھ بولتی ۔ وہ بھاگتا ہوا نظر آیا۔ اس حسین جوڑے نے بے ساختہ ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اتنا بڑا شہر بڑی بڑی بسیں ۔ موٹریں اور آدمیوں کی بھیڑ آج وہ تین دن سے بھوکا تھا۔ اپنا دکھ درد کسی سے نہیں کہہ سکا تھا۔ کیونکہ وہ شہری چمک دمک دیکھ کر بہت حد تک خوفزدہ ہو گیا تھا۔ لیکن بھوک بھی اسے پریشان کر رہی تھی ۔ بھوک کا درد ایسا تھا کہ اس کا ہاتھ ایک دو جگہ پھیل ہی گیا۔ ایک نے کہا۔ ''بھلے چنگے ہو جاؤ کماؤ کھاؤ'' وہ بغیر سمجھے آگے بڑھ گیا۔ سڑک کے کنارے ٹیوب ویل پر ایک انسان کو پانی پیتے دیکھا پھر اس نے بھی اس ٹیوب پر جا کر پانی پیا۔ اسی طرح جہاں بھی خواہش ہوتی پانی پی لیا۔ نقاہت اور تھکن کے باعث اب اس کا چلنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ رات وہ بس اسٹاپ کے ایک شیڈ کے نیچے قمیص کو سراہنے رکھ کر سویا۔ صبح اُٹھنے پر اپنی قمیص نہ پا کر وہ حیران ہو گیا تھا۔ اور پھر وہ ننگے بدن ہی چل پڑا۔ اس کی کوئی منزل نہ تھی۔

وہ بڑھتے بڑھتے بہت دور تک پہنچ گیا تھا۔ اسے اپنی آنتوں میں درد سا محسوس ہونے لگا تھا۔ گلے میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ وہ فٹ پاتھ سے اٹھا اور سڑک کے دونوں کنارے ٹیوب ویل ڈھونڈنے لگا۔ کچھ آگے بڑھ کر ایک ٹیوب ویل ملا۔ اس نے بھر پیٹ پانی پیا۔ پانی پینے کے بعد اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر تھپکی دی تو اس کا پیٹ ڈھولک کی طرح بجنے لگا۔ اور پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے چاروں طرف اپنی آنکھ کی پتلی گھمائی تو سامنے اسے بڑی بڑی کوٹھیاں نظر آئیں۔ کوٹھیوں کی طرف اس کے قدم خود بخود اٹھنے لگے۔ اس نے دیکھا اس نے کوٹھیوں کے سامنے ہری بھری بڑی گھاسوں کی دیواریں ہیں۔ اس کا دل خوف سے کانپنے لگا۔ وہ کسی کوٹھی میں داخل ہونے کی ہمت اپنے آپ میں نہیں پا رہا تھا۔ اسی طرح پانچ چھ کوٹھیاں طئے کرتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔ یک بیک اسے خوشبو محسوس ہوئی۔ وہ رک گیا

اس بڑے اجنبی شہر میں یہ خوشبو اسے جانی پہچانی سی لگی۔ وہ زور زور سے سانس لینے لگا۔ اور اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ وہ اس کوٹھی کی دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا اور خوشبو سونگھتا رہا۔ بہت دیر کے بعد اس نے پردے کو اپنے گندے ہاتھ سے ذرا کھسکا کر دیکھا اس کی نظر ایک سفید وردی اور سفید پگڑی والے آدمی سے جا ٹکرائی۔ ''ارے کون ہے؟ یہاں کیا کر رہا ہے؟'' سفید وردی والے کی آواز سن کر وہ خوف سے کانپنے لگا اور سمٹ کر گٹھری بن گیا۔ آہستہ آہستہ اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ ایک اور آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''اے ادھر آؤ۔ وہاں کیا کر رہے ہو؟ وہ کھڑا ہو گیا۔ ''اے صاحب بلا رہے ہیں؟'' اس نے دیکھا پگڑی والا کہہ رہا ہے۔ وہ کیسے بڑھے۔ جانے کیا ہو؟ وہ پس و پیش میں پڑ گیا تھا کہ ایک کڑک دار آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''کیا چاہتے ہو؟'' اس نے پلک اٹھائی اس کے ہونٹ ہلے۔ ''بھوک لگی ہے''؟ جواب میں گردن دو مرتبہ جھکی۔ ''تو دیکھ کیا رہا ہے اندر آجا۔ ''کم ان'' صاحب کی رعب دار آواز سن کر گھبرا گیا۔ اسے لگا اس کے پیر زمین میں دھنس گئے ہیں۔ جانے مونچھوں والا صاحب کیا برتاؤ کرے۔ اسے اس طرف نہیں آنا چاہئے تھا۔ ''اے بہرہ ہے کیا؟ مونچھ والے صاحب کی کڑک دار آواز اس کے سارے جسم کو لرزا دیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ زمین کے چھوٹے چھوٹے ریزے اسے پتھر دکھائی دے رہے تھے۔ ''چلو اندر چلو'' اور وہ پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ''بیٹھ جاؤ!'' وہ اپنے بدن کو سمیٹ کر ڈرتے ڈرتے زمین پر بیٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ کڑک دار آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''نیچے نہیں۔ یہاں بیٹھو صوفے پر'' وہ پھر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ بڑی بڑی کرسیاں، ٹیبل، صوفے اور پردے! میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ''۔

''سنتے نہیں صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟'' نوکر نے کہا۔ اس کی آنکھیں رحم کی بھیک مانگتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ وہ اس گدّے دار صوفے پر کیسے بیٹھے گا۔ وہ......۔

''بیٹھو'' آواز اور بھی کرخت ہوگئی۔ ''ہاں بیٹھو'' نوکر نے پھر دہرایا۔ ''اے تم یہاں کیا کر رہا ہے چلو کھانے کا بندوبست کرو''۔ صاحب نے نوکر سے کہا۔ نوکر تیزی سے اندر چلا گیا۔ وہ ابھی تک اسی طرح کھڑا تھا۔ بالکل سمٹا ہوا۔ ''ارے تم ابھی تک کھڑے ہو۔ بیٹھو، سٹ ڈاؤن!!''

وہ خوف سے سہما ہوا گدی دار صوفے کے نزدیک آیا۔ ایک منٹ کھڑا رہا۔ پھر اتنی تیزی سے اچھل کر صوفے پر بیٹھا کہ اسے خود پتہ نہ چلا کہ وہ کیسے اور کب اس صوفہ پر بیٹھا ہے۔ اس کی دونوں ٹانگیں ایک دوسرے پر چڑھ گئی تھیں۔ اسے اس طرح بدحواس صوفے پر بیٹھا دیکھ کر صاحب نے زور سے قہقہہ لگایا اور پھر مسکرانے لگے۔ ان کا جسم ہنسی سے دوہرا ہونے لگا۔ ہا...... ہا...... ہا...... ایک دم چھوئے کی طرح 'وہاٹ اے بیوٹی فل سائٹ''۔ پھر نگاہیں دوسری طرف پلٹ گئیں اور نوکر کو سامنے کی دیوار سے پیٹھ لگائے کھڑے دیکھ کر ان کی بھنویں تن گئیں۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی لہر دوڑنے لگی۔ ''کریم'' صاحب چلائے۔ ''جی صاحب!'' اور نوکر فوراً ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''تم نے ان صاحب کے لئے کھانا نہیں لگایا؟ نوکر دوبارہ اندر کی طرف دوڑا۔ ''صاحب''! اس کے لئے ''صاحب''۔ اس کا دل چاہا وہ کچھ کہے۔ ''صاحب تو آپ کا نام ہے صاحب۔ ہمارا نام تو بنگڑو ہے۔ اب اسے یہ صوفہ آرام دہ معلوم ہورہا تھا۔ اور خوف بھی تقریباً ختم ہورہا تھا۔ اب اسے پھر بھوک ستانے لگی تھی۔

''اے چلو کھانا کھالو''۔ نوکر نے کہا۔ اس نے ہاتھ پھیلا دیا بھیک مانگنے کے لئے۔ اس کے پھیلے ہاتھ دیکھ کر صاحب ہنسنے لگے تھے۔ ہنسنے کی رفتار میں تیزی آگئی اور پھر اس کی طرف ہاتھ کا اشارہ رکرتے ہوئے کہا۔ ''بھیک منگا''۔ ایک دم بھیک منگا۔ بھیک منگا!'' صاحب کی ہنسی سے وہ اور بھی سمٹ گیا تھا۔ نوکر اندر باہر بھاگ رہا تھا۔ میز پر سفید سفید پلیٹیں لگا رہا تھا۔ کھانا میز پر لگ جانے کے بعد صاحب نے کہا۔ ''چل کھا''۔ وہ پس و پیش میں پڑ

گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو پھر اس نے ہاتھ پھیلا دیا۔ اس کے منہ سے رال بہ دستور ٹپک رہی تھی۔ اور اس کے ننگے پیٹ کو بھگو رہی تھی۔ صاحب نے پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ''کریم''

''جی صاحب'' نوکر فوراً ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔

''ہمارا فوٹو کیمرہ لاؤ۔'' نوکر تھوڑی دیر بعد فوٹو کیمرہ لے کر حاضر ہو گیا۔ یک بیک کیمرہ کی فلش لائٹ چمکی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''یہ فوٹو بہت نیچرل آئے گا''۔ سامنے بڑی سی میز پر کھانا لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھوک کی پرچھائیاں تھیں اور رال ٹپکتی جا رہی تھی۔ انگریز صاحب رال دیکھ کر پھر ہنسنے لگے۔ ''لائک اے ہنگری ڈاگ!''۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ سامنے والی میز پر رکھے کھانے پر جھپٹ پڑے۔ لیکن اس کے پیر بندھ سے گئے تھے۔ کیوں؟ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ انگریز صاحب درمیان میں مختلف گوشوں سے اس کی تصویر لئے جا رہے تھے اور اس کی آنکھیں فلیش لائٹ سے بار بار چوندھیا جاتی تھیں۔ صاحب کی ان عجیب و غریب حرکات پر اسے خوف آ رہا تھا ''ہیر۔ ہیئر۔ ہیر''۔ انگریز صاحب نے کہا۔ انہوں نے میز کے نیچے سے ایک کرسی کھینچی۔ ''یہاں بیٹھ کر کھاؤ۔ لائک اے مین'' اور وہ جلدی سے کرسی پر جا بیٹھا اور ایک ٹانگ دوسری پر چڑھا کر کھانے پر جھپٹ پڑا۔ اب اسے کیمرے کا خوف ذرا بھی نہیں تھا۔ وہ کھانا کھانے میں محو ہو گیا اور انگریز صاحب کرسی پر بیٹھے بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے۔ مسلسل دیکھ رہے تھے۔ ان کی مونچھیں خوشی سے ہل رہی تھیں۔ وہ بے فکر کھانے میں مگن تھا۔ ساری میز گندی ہو گئی تھی لیکن وہ اسی طرح سب سے بے خبر کھائے جا رہا تھا اور بہت تیزی کے ساتھ کھا رہا تھا۔ ایک چپاتی کو صرف دو نوالے بنا کر صاف کر جاتا۔ نوکر مستعدی سے کھانا کھلا رہا تھا۔ انگریز صاحب کے کیمرے کا فلش درمیان میں کبھی کبھی چمک جاتا۔ صاحب یک بیک صوفہ سے اچھل کر چلا

پڑے۔ ''فاؤنڈایٹ ہیرز ہینگر پر سافائیڈ۔ ہمارا جرنل کے لئے کتنا نیچرل مٹیریل ہے۔ ''ونڈرفل--!'' صاحب خوشی سے تالی بجانے لگے۔ نوکر اتنا ہی سمجھ پایا تھا کہ اُس آدمی میں صاحب کو اپنے دیش کے اخبار کے لئے کچھ میٹر مل گیا ہے۔ جس میں ان کی کھینچی ہوئی تصویریں شائع ہوتی تھیں۔ نہیں تو اس آدمی کی اتنی تصویریں کیوں کھینچتے؟ صاحب اپنے ہونٹوں سے سگار لگائے اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ شاید کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔

صاحب نے دیکھا اس آدمی کا منہ پیٹ اور ہاتھ، دال سبزی اور شوربے سے سن گئے تھے۔ اس پوز کو بھی انگریز صاحب کے کیمرے نے قید کرلیا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ ''اور کھاؤ''۔ صاحب کی آواز میں نرمی تھی۔ جواب میں اس نے ''نا'' کے لئے سر ہلا دیا۔ صاحب اس کی طرف دیکھتے ہوئے۔ بڑبڑائے۔ ''سیٹی فیکشن پر سانو فائیڈ، وہاٹ اے بیوٹی فُل سائٹ''۔ اس درمیان وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر اور ندامت کی لہر دوڑ گئی۔ صاحب مسکرا رہے تھے اور دلچسپی سے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ نوکر میز صاف کرنے میں مشغول ہو گیا تھا وہ چپ چاپ کھڑے کھڑے کیمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ''اے کیا دیکھ رہا ہے؟ اس اچانک آواز کو سُن کر وہ پھر کانپ گیا۔ ''کو......کو...... کچھ نہیں صاحب''۔ اور کچھ مانگتا؟ اپنی تھنگ؟ ''نہیں''۔ اس کے ہونٹ دھیرے سے ہلے صاحب اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دبائے کسی خیال میں غوطہ زن تھے اور اسے بغور دیکھے جا رہے تھے۔ پھر ایک بیک بولے ''تمہارا نام کیا ہے؟ اُدھر بیٹھو صوفہ پر ہم تمہارا ایک اور تصویر لینا چاہتا؟ سٹ ڈاون۔'' انہوں نے کیمرہ اپنی بائیں آنکھ سے لگایا۔ وہ وہیں کھڑا تھا۔ ارے تم ابھی تک ادھر کھڑا ہے۔ صوفے پر بیٹھنے مانگتا۔ کم آن، ادھر بیٹھو۔ وہ وہیں کھڑا تھا۔ اسی طرح۔ 'تم نہیں بیٹھے گا۔'' صاحب کی آواز میں غصہ تھا۔ ''نہیں''۔ اس کی آواز میں ایک وقار تھا۔ ''وہاٹ! ہم تم کو کھانا کھلایا۔ تم ہمارا بات نہیں مانتا۔ کریم ابھی اس کو باہر نکالو۔ ہم اس کو دیکھنے نہیں مانگتا۔''

صاحب کا سارا جسم غصہ سے کانپ رہا تھا۔ نوکر اس کی طرف بڑھا اور ہاتھ پکڑ کر انگریز صاحب کے گھر سے باہر نکال دیا۔ وہ پھر سڑک پر آ گیا تھا۔ آگے قدم سنبھل سنبھل کر بڑھا رہا تھا۔ اس کی چال میں نزاکت اور وقار کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ اس وقت بھی سڑک سنسان تھی۔ بس اسٹاپ پر اس وقت بھی ایک جوان حسین جوڑا کھڑا تھا۔ جوڑے کو دیکھ کر وہ سہما نہیں۔ بلکہ اس جوڑے کے نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا۔ جوڑے نے اپنے پاس اسے کھڑا دیکھ کر ناک بھنوئیں چڑھالیں اور دوسری طرف کھسک گئے۔!!!

واپسی

میں ایک دفتر میں کلرک ہوں۔شاید آپ کو یقین آئے نہ آئے لیکن میں انتہائی ایماندار ہوں، ترقی حاصل کرنے کے لئے میں نے کبھی ناجائز طور طریقے اختیار نہیں کئے مجھے کبھی روپے پیسے کی ہوس نہیں ہوئی حالانکہ پورے گھر کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ بوڑھے ماں باپ ہیں چھوٹے بہن بھائی ہیں پھران سب کی اپنی اپنی ضرورتیں ہیں۔ جنہیں پورا کرنا میرے ہی فرائض میں داخل ہے اس لئے کہ میں گھر میں بڑا ہوں۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے سبب اور ٹائم (Over Time) بھی کرتا ہوں، پھر بھی کوشش کے باوجوداپنے لئے کچھ بھی نہیں بچا پاتا۔ میں اکثروبیشتر سنڈے بازار سے خریدے ہوئے کپڑے پہنتا ہوں اور سگریٹ پان تک کا بھی روادار نہیں۔

مجھ جیسے ایک عام شخص کے لئے یہ باتیں یقیناً ذہنی پریشانی کا باعث ہوتی ہیں۔جب میں اپنی اس مصروف زندگی دو کمروں والے گھر سب ہی بہنوں، بھائیوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں حتی کہ اس دنیا سے دل برداشتہ ہوجاتا ہوں، سنیما دیکھے ہوئے مدت گزر جاتی ہے۔ساتھیوں کے طعنے سنتا ہوں، چپ رہتا ہوں کہ اس کے سوااور کوئی چارہ ہی نہیں۔ یہ سب ہی مجھ سے کہیں آگے نکل چکے ہیں۔اچھا لباس پہنتے ہیں۔ خوشبوئیں استعمال کرتے ہیں۔بہترین سگریٹ پیتے ہیں اور میں؟

یہ سب کے سب مجھ سے کہیں زیادہ دلیر ہیں۔میں ان کے مقابلے میں بالکل

بدھواور ڈرپوک ہوں، اس پر بھی مجھے اس سے قدرے تسکین ہوجاتی ہے کہ میں اپنے ماں باپ کی نصیحتوں پر عمل کرتا ہوں، میرا ضمیر مطمئین ہے اور ذہن میں کوئی الجھن نہیں۔ کیا ہوا۔ جو میرا اسٹینڈرڈ ہائی نہیں۔ مجھ ایسے لوگ ایسا ہی سوچتے ہیں۔

اس لڑکی کو میرے دفتر میں آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے ہیں۔ وہ ٹائپسٹ کی حیثیت سے آئی ہے۔ اس کا لباس اور اس کا چہرہ اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ وہ بھی میرے ہی جیسے طبقے سے متعلق ہے۔ نہایت خاموشی سے اپنے کام میں لگی رہتی ہے۔ اُسے اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ دفتر کے لوگ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟ اور کیا خیال رکھتے ہیں؟ وہ بالکل سپاٹ چہرہ لئے ہوئے کام کرتی رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے گھر میں اس کے سوا کوئی اور ہے ہی نہیں کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس سے کچھ بات کروں۔ اُسے چائے کی پیالی اُفر کروں مگر میں فطرتاً کم ہمت واقع ہوا ہوں، اس لئے صرف سوچتا ہی رہ جاتا ہوں۔

کئی دنوں سے میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سوچنے لگا تھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے یہ لڑکی میرا آئیڈیل ہو، میں خود کو اس کی طرف کھنچتا ہوا محسوس کررہا تھا اس سے ہمدردی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ مجھے خیال ہوتا تھا۔ چند سو روپیوں میں اس کا اور اس کے گھر والوں کا کیسے گزارہ ہوتا ہوگا۔ اس کے بھی ہمارے ہی جیسے زیادہ بہن بھائی ہوں گے اور ان سب کی ضرورتیں پوری کرنے والی صرف ایک ہوگی۔ اس سوچ نے یہاں تک بڑھا دیا کہ میں نے دل ہی دل میں ارادہ کرلیا تھا کہ اسی لڑکی سے شادی کروں گا۔ ہم دونوں مل جل کر خرچ اٹھالیں گے اور اپنا گھر بنالیں گے۔ مجھے ان دنوں کام کے سوا بس یہی ایک سوچ تھی۔ خوش آئند خواب دیکھتا رہتا تھا۔

اس روز آفس سے اُٹھنے کے بعد میں بازار گیا۔ مجھے گھر کے لئے کچھ چیزیں خریدنا تھا۔ میں اچانک ٹھٹک سا گیا۔ وہی لڑکی میرے سامنے تھی اور میں اُسے دیکھ بھی

نہیں رہا تھا۔ مجھے یوں ٹھٹکے ہوئے دیکھ کر مسکرادی۔ اس کی مسکراہٹ سے مجھے کچھ حوصلہ ہوا میں اس کے پاس گیا۔ ''آپ یہاں کیسے؟'' گھبراہٹ میں صرف یہی سوال سوجھا۔ ''جیسے آپ؟''۔ اس نے مخصوص مسکراہٹ سے جواب دیا۔ گویا میری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہورہی ہو، وہ شام میرے خیالوں کو سجا دینے والی بڑی خوبصورت شام تھی۔ وہ کافی دیر تک میرے ساتھ رہی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتایا تھا۔ اور میرا اندازہ درست ہی تھا کہ وہ بھی میرے طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ میرے لئے بڑے اطمینان کی بات تھی۔ مجھے اپنے خوابوں کی تعبیر نکلتی ہوئی نظر آنے لگی اُس نے یہ بھی تو کہا تھا کہ دفتر میں سب لوگوں میں، میں ہی ایک اچھا آدمی ہوں جو لڑکیوں کی پھبتی نہیں اُڑاتا اور فقرے نہیں کستا۔ یہی ایک بات میرے قدم خوشی سے زمین پر پڑنے نہیں دے رہی تھی۔

اگلے روز دفتر پہنچنے پر میں اُسے سلام کیا اس نے مجھے دیکھا اور مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر آتے آتے رک گئی تھی۔ وہ زیرلب جواب دے کر اپنے کام میں مشغول ہوگئی تھی اس کا چہرہ پہلے ہی کی طرح سپاٹ تھا جیسے اُسے مسکرانا ہی نہیں آتا ہو۔ کئی روز تک میری اس سے کوئی بات نہ ہوسکی۔ نہ ہی اُس نے کوئی موقع دیا۔ میں بھی تو نہیں چاہتا تھا کہ ہم دونوں کا کوئی اسکینڈل گھڑ لیا جائے یا اس کے دل میں میرے لئے جو ''عزت'' ہے وہی نہ جاتی رہے۔

ایک روز لنچ ٹائم میں جب سب لوگ چلے گئے میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا ۔اسی مقصد سے خود کو ذرا مصروف رکھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کی آواز میرے کانوں میں رس گھول گئی۔ ''بہت لگن رہتی ہے کام کی، لنچ کا خیال بھی نہیں رہتا آپ کو''۔ میں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا وہ کھانا کھاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔ ''نہیں ایسی بات تو نہیں''۔ میں کاغذات سمیٹتے ہوئے بولا''۔ ایک بات کہوں آپ سے اگر آپ بُرا

نہ مانیں تو'' وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کا یہی انداز میرے حوصلے پست کر دیتا تھا۔

''کسی روز آپ میرے ساتھ چائے پئیں''۔ کس سلسلے میں؟ بڑے روکھے انداز میں اس نے پوچھا۔

''کوئی خاص بات تو نہیں۔ ویسے ہی''۔ میں نے کہا تھا اور میں تیزی سے باہر چلا گیا۔ میرا دل ٹوٹ سا گیا تھا۔ اچھا خاصا خوش گوار موڈ ناگوار ہو گیا تھا۔ شاید اُسے بھی اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لئے جب میں کھانا کھا کر آیا، تو وہ دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ میں نے توجہ نہ دی اور اپنے کام میں بزدلانہ انداز میں مصروف ہو گیا۔

اگلے روز میں نے اُسے سلام بھی نہ کیا۔ لنچ ٹائم میں بھی سب لوگوں کے ساتھ باہر چلا گیا۔ لیکن شام کو مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب وہ بس اسٹاپ پر میرے قریب آ گئی۔

میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ آفس کے کچھ اور لوگ بھی کھڑے تھے۔

''آج آپ اپنی بس مِس کر دیں، ہم کہیں چائے پئیں گے''۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک ریسٹورینٹ میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ کل کی ناراضگی دور ہو گئی تھی۔ پھر جو بات میں نے اسے کہی تھی اس کا موقع اس نے خود ہی لے لیا تھا۔ میں نے لمبی چوڑی تمہید باندھی اور اسے بتایا کہ میں اِس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میری بات سن کر نہ تو وہ چونکی اور نہ ہی حیران ہوئی۔ صرف ہمیشہ کی طرح مسکراتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ ہمارے معاشرے میں مرد اور عورت کے درمیان صحت مند دوستی کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ آپ مجھے دوسرے مردوں سے ذرا مختلف نظر آئے تھے اس لئے میں نے آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ لیکن کل

جب آپ نے ایک خاص انداز میں مجھے چائے کی دعوت دی تو میں ایک حد تک سمجھ گئی کہ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ مجھے آپ کے احساسات اور جذبات کا پاس ہے۔ لیکن میری سوچ آپ سے مختلف ہے۔ میں اپنی ماں کی طرح سسک سسک کر زندگی گزارنا نہیں چاہتی ۔آپ کے ساتھ شادی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میں تمام عمر چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے ترستی رہوں۔ اور میرے صبح وشام اسی طرح بسوں میں دھکے کھاتے اور ٹائپ کرتے گزریں۔ میرے دل میں اب بھی آپ کی عزت ہے اور رہے گی لیکن میں چاہتی ہوں کہ ہم ہمیشہ اچھے دوستوں کی طرح رہیں اور بس"۔!!!

☆☆☆

فُرصت

سویرے ساڑھے دس بجے بمبئی کا مشہور دلال بھائی پٹیل اپنے آفس آیا۔ آج وہ اکیلا نہیں تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ اسٹینو مس تھاپر بھی تھی۔ مدراسی سکریٹری رام چندرن پہلے ہی سے آفس میں موجود تھا۔ اور کچھ کاغذوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے باس کو دیکھتے ہی کُرسی سے کھڑا ہو گیا۔

''گڈ مارننگ''۔!

''گڈ مارننگ۔''، پٹیل جواب دیتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رام چندرن کو حیرت ہوئی۔ کیونکہ آج خلاف معمول مِس تھاپر، پٹیل کے ساتھ آئی تھی اور مس تھاپر کے چہرے پر اور دنوں سے زیادہ خوشی جھلک رہی تھی۔ آج اُس نے بہت سلیقہ سے میک اپ کیا تھا اور اپنے بالوں میں سُرخ گلاب کا پھول لگا رکھا تھا۔ جس کی بھینی بھینی خوشبو سے پورا آفس مہک رہا تھا۔

مِس تھاپر اپنی جگہ پر نہیں بیٹھی۔ سکریٹری رام چندرن نے سوچا کہ شاید مِس تھاپر تین دنوں کی غیر حاضری کے سبب آج کام سے الگ کردی گئی ہے۔ لیکن وہ اتنی خوش کیوں نظر آرہی ہے؟ وہ کچھ دیر آفس کے گیسٹ روم میں بیٹھی رہی پھر اِدھر اُدھر

ٹہلنے لگی اور کچھ دیر بعد پٹیل کے کمرے میں چلی گئی۔ شیئر مارکیٹ کا مشہور دلال پٹیل ''پارکھ چیمبر'' کی ساتویں منزل کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں اپنے کام میں مشغول تھا، وہ ہر دو منٹ بعد فون رسیو کر رہا تھا۔ شیئر بازار میں قیمتوں میں کمی بیشی ہو رہی تھی۔ کچھ چیزوں کے بزنس میں نقصان ہو رہا تھا۔ اس لئے وہ گھبرایا ہوا تھا۔

''ہیلو۔''

''کہو کیا کوئی کام ہے؟'' اس نے کہا۔

''نہیں۔ کوئی خاص نہیں'' کھوئی کھوئی سی مس تھاپر بولی اور پٹیل کے کمرے سے نکل کر سکریٹری کے کمرے میں چلی گئی۔

''مسٹر رام چندرن، کیا صاحب نے تین روز پہلے کوئی نئی اسٹینو رکھنے کے لئے کہا تھا''؟ اُس نے پوچھا۔

''جی ہاں، آج ہی تو انٹرویو ہے۔'' رام چندرن نے کہا۔

''اوہ!'' مس تھاپر نے کہا۔ ''اچھا تو جب تک کوئی نئی اسٹینو نہیں آتی میں ہی کام کروں گی'' اور وہ کمرے میں چلی گئی۔ اسٹینو کا کمرہ پٹیل کے کمرے سے بالکل نزدیک تھا، تا کہ پٹیل جب چاہے اپنے اسٹینو کو بُلا سکے۔

اسی درمیان پٹیل کے پاس کام بڑھ گیا اور فونوں کی رفتار میں تیزی آ گئی وہ بہت زیادہ اپنے کاموں میں مشغول رہا اور اُسے دین و دُنیا کی کوئی خبر نہیں رہی۔ وہ صرف اپنے بزنس کا حساب کرتا رہا۔ اس کا ذہن مشین کی طرح چل رہا تھا۔ اس کی پونجی جن چیزوں میں لگی ہوئی تھی۔ ان کی حالت بازار میں بڑی نازک ہو رہی تھی اس کا اندازہ پٹیل کی بے چینی سے لگایا جا سکتا تھا۔ رام چندرن اس درمیان کئی بار پٹیل کے کمرے میں کاغذ لے کر گیا اور لوٹ آیا۔ لیکن پٹیل کو فون سے فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ ان کاغذوں پر نگاہ ڈالتا۔

پٹیل کی نظر یک بیک اپنے سکریٹری رام چندرن کے کمرے کی جانب اُٹھی جہاں وہ سُنہرے بالوں والی ایک موٹی سی لڑکی سے باتیں کر رہا تھا۔ اُس نے موٹی لڑکی کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور پٹیل پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

''سر لیجیے یہ آ گئی''۔ رام چندرن نے کمرے میں اچانک پہنچ کر کہا۔

''آ گئی''۔ ''کون۔ کیوں؟۔ کس لئے آ گئی؟'' پٹیل نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آپ نے ایک نئی اسٹینو رکھنے کے لئے کہا تھا نا۔ اُس کے لئے درخواست آئی تھی اور آپ نے انہیں انٹرویو کے لئے بلایا تھا۔ اس لئے یہ......'' ابھی سکریٹری رام چندرن اپنی پوری بات کہہ بھی نہ پایا تھا کہ پٹیل اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اور کہا۔ ''نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ ہم نے کسی کو نہیں بلایا تھا۔ مس تھاپر تو ہے۔ وہ ٹھیک کام تو کرتی ہے۔ ہمارا دماغ تو نہیں خراب ہوا ہے کہ اُسے بے وجہ نوکری سے ہٹا کر کسی اور کو رکھ لوں۔ وہ جب تک کام کرنا چاہے کرنے دو۔ ہم اُسے کبھی نہیں ہٹائیں گے۔ جائیے مس...... ہمارے یہاں کسی اسٹینو کی ضرورت نہیں ہے۔!''

موٹی لڑکی بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ سکریٹری رام چندرن تھوڑی دیر کھڑا پٹیل کو دیکھنے لگا اور پھر کچھ دیر بعد کمرے سے نکل کر اکاؤنٹنٹ کے پاس چلا آیا اور دھیرے سے کہا ''بڈھا سٹھیا گیا ہے''۔ اکاؤنٹنٹ ڈیسائی ہنسا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ پٹیل کے کام میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ کبھی کبھی میز پر پڑے ہوئے کاغذوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا اور پھر فون پر جھک جاتا۔ اس کے ہاتھ میں ایک قلم تھا۔ جس سے وہ کاغذ پر حساب کر رہا تھا۔ ابھی وہ حساب کر ہی رہا تھا کہ تیز خوشبو سے اس کا دماغ معطر ہو گیا۔ اُس نے سامنے کی طرف دیکھا۔ نظر

شیشے کی دیوار کے اُس پار مس تھاپر پر جاپڑی۔ وہ محوِ حیرت خاموشی سے مس تھاپر کو دیکھتا رہا۔ آج وہ بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ حسن، سادگی، معصومیت، پٹیل اس کو عجیب نظروں سے تکتا رہا۔ اور مس تھاپر کی مخروطی انگلیاں ٹائپ رائٹر پر دوڑتی رہیں۔ یکا یک مس تھاپر نے پلٹ کر دیکھا۔ دونوں کی خاموش حسرت زدہ نظریں ملیں اور جھک گئیں۔ پٹیل کے سر پر جو شیئر مارکیٹ کا بھوت سوار تھا وہ یک بیک ختم ہو گیا اور وہ خوبصورت مس تھاپر کے خیالوں میں ڈوب گیا۔ دونوں ہاتھوں میں کاغذ اور قلم دبائے ہوئے وہ اپنے کمرے سے مس تھاپر کے کمرے میں چلا گیا۔ مس تھاپر نے قدموں کی آہٹ سُن کر نظریں اُٹھا دیں۔ سامنے اپنے باس کو آتے دیکھ کر وہ کرسی سے اُٹھ گئی۔ مگر نگاہیں ٹائپ رائٹر پر مرکوز تھیں۔

''ہیلو''۔ وہ قریب اور قریب آتا گیا۔

مس تھاپر نے اپنی نیم باز پلکوں کو اوپر اُٹھایا تو پٹیل سے نظر مل گئی۔ مس تھاپر کی دھڑکنیں بڑھ گئیں۔ وہ شرم و حیا سے جھکتی چلی گئی۔ اُس کا حُسن کچھ اور دل فریب ہو گیا، جس کی رعنائیوں میں پٹیل ڈوب سا گیا۔

''مس تھاپر''۔

''ہوں''۔

''تم تو آج بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ میری طرف دیکھو میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں...... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہیں اپنے من مندر میں......'' پٹیل بالکل جذباتی انداز میں کہتا چلا گیا۔

''آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں''؟ مس تھاپر شرم سے بوجھل ہوتی ہوئی بولی۔

"نہیں کیسی ویسی بات نہیں ۔ پلیز ۔ ہاں ۔ کردو مِس تھاپر ۔"

ابھی پٹیل کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ مِس تھاپر کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمنڈ پڑا۔ لیکن فوراً کسی بات کا خیال آتے ہی مِس تھاپر نے آنسو پی کر زیر لب مُسکرا دیا اور پھر اپنا ایک بازو پٹیل کی گردن میں ڈال کر جھول گئی اور کہا "اوہ" اب سمجھ میں آیا ڈیر یہ تمہارا قصور نہیں، یہ تو ہمارے دھندے کا قصور ہے۔ اس دھندے کے پیچھے تم نے سب کچھ بھلا دیا۔ میں تو ڈر گئی تھی کہ تم اب آج کونسی نئی بات کہنے آئے ہو۔ لیکن خیر۔ اچھا ہی ہوا ڈیئر۔ کیا تم بالکل بھول گئے؟ تین دن قبل جو ہماری شادی ہوئی تھی جس میں تم نے اپنے سبھی ساتھیوں کو دعوت بھی دی تھی۔ کیا تم سب کچھ بھول گئے ڈیئر۔ بولونا۔"

"اوہ! ہاں، اب یاد آیا۔ معاف کرنا کمبخت کاروبار سے فرصت کہاں ملتی ہے۔"

☆☆

میری کہانی

''اُٹھ نا لیناؔ۔ نائٹ پریئر میں نہیں چلے گی۔''؟

''مریناؔ! اگر میرے چاہنے پر ایسا ہوتا تو شاید میں پریئر میں کبھی نہیں جاتی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں عیسیٰ مسیح سے پیار کرتی ہوں، لیکن مجھے ان کے چیلوں کے بنائے ہوئے اصولوں سے سخت نفرت ہے''۔

''دیکھ لیناؔ، تو پھر پگلی جیسی باتیں کرنے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تو مشن میں کیسے آگئی''؟

مریناؔ، مشن میں پرورش پاکر بھی تو مجھ سے ایسی بات پوچھتی ہے۔'' ماں غریب ہو اور اس کے پاس خود بھی کھانے کو نہ ہو تو وہ اپنی بچی کو سڑکوں پر آوارہ گھومنے کے بجائے مشن میں داخل کردینا بہتر سمجھتی ہے''۔ اور یہ جملہ کہتے ہوئے لیناؔ کے رخسار بھیگ گئے۔

''مجھ کو معاف کردے لیناؔ۔'' اور مریناؔ اپنی انگلیوں سے اس کے رخسار کے آنسو پونچھ دیئے۔

''چل لیناؔ، پریئر میں چلیں۔''!

''چل! مگر مریناؔ، میرے سر میں آج بہت درد ہے اور میرا...... میں پریئر سے بھی......!''

''تو پھر جاتی کیوں ہے۔''؟ آرام کر''۔اور مرینا نے لینا کو زبردستی بستر پر لٹا دیا۔اور کہا۔''دیکھ تو آرام کر، میں جلد پریئر سے آجاؤں گی''۔اور جب مرینا جانے لگی تو لینا نے کہا۔''مرینا میں بھی چلوں گی، میرے نہ جانے سے سسٹر ناراض ہو جائیں گی اور کل......''

نہیں لینا، تو آرام کر پھر کل کی بات آج نہیں سوچا کرتے''۔اور پھر مرینا کمرے سے چلی گئی۔دوسرے دن مارننگ پریئر کے بعد سسٹر نے پوچھا۔''لینا، کل تم نائٹ پریئر میں نہیں آئی کیوں۔''؟

''جی میم صاحب......سر میں بہت درد تھا''۔

اوہ یو فول۔درد......درد......درد......میں تو تم سے تنگ آگئی۔جب دیکھو نائٹ پریئر سے جی چراتی ہے اور پھر ایک تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا۔لیکن وہ بالکل خاموش رہی، اسے اس مشن میں یہی تعلیم ملی تھی۔

جب اپنے کمرے میں لینا واپس آئی تو مرینا نے پوچھا۔''کیا ہوا لینا''۔؟

''کچھ بھی تو نہیں۔''!

''مگر تیری آنکھیں پرنم ہیں۔''؟

لینا ایک پھیکی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر نمودار کرتے ہوئے بولی۔''تو کیا ہوا؟ ان آنکھوں کو تو اب عادت سی ہو گئی ہے۔اچھا، اب چلو ہسپتال جانے کی تیاری کریں''۔

مرینا کچھ نہیں بولی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اسکی آنکھیں برابر پرنم کیوں رہتی ہیں؟ ڈیوٹی ختم ہونے پر لینا اپنے روم میں چلی آئی۔وہ بہت خوش تھی۔ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی نے اسکو خوشیوں کا ہمالہ دے دیا تھا۔اس کے ہاتھوں میں ننھا سا ایک گلاب تھا جس کو وہ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی، اور اس گلاب کو اپنے ہونٹوں سے چومنے لگی تھی۔

''کیا بات ہے لینا؟ بڑی خوش نظر آ رہی ہو''۔

"ہاں مرینا۔ آج میں صحیح معنوں میں خوش ہوں، بہت خوش"۔

"آخر بات کیا ہے۔"؟

"نہیں بتاتی۔" لینا شرم سے دوہری ہوتی ہوئی بولی۔

"میری قسم"۔

"اُف فوہ۔! تم بہت وہ ہو؟"

"وہ بیڈ نمبر گیارہ پر جو مریضہ ہے نا"۔ کچھ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"کون سنتھیا۔"؟

"ہاں سنتھیا۔ آج جب میں اُدھر سے گذر رہی تھی تو وہ پہلے کی طرح منتظر تھی، وہ پوچھ بیٹھی۔ "کیا بات ہے نرس وہ اب تک نہیں آئے؟"

کون۔؟

"پمّی کے ڈیڈی"۔

"شاید وہ کسی کام میں الجھ گئے ہوں اور ہوسکتا ہے کہ آج نہ آئیں"۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا رنگ سیاہ ہوگیا۔ میں سمجھ گئی۔ اس بات کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے میں نہ کہا۔ "مگر سنتھیا! مجھے یقین ہے کہ پمّی کے ڈیڈی ضرور آئیں گے" یہ سن کر اس کے چہرے کا رنگ گلاب کی طرح کھل اُٹھا۔!

"دیکھو! نرس وہ لوگ آرہے ہیں۔"

اور سچ مچ ایک چار پانچ برس کی بچی اپنی ماں کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ "لو ممی تمہارے لئے ایک پھول لیکر آئی ہوں"۔ مریضہ نے اپنے کمزور ہاتھوں میں پھول لیکر سونگھ لیا۔

"آہ! کتنی پیاری خوشبو ہے"۔!

"ہاں سنتھیا! جب تم اچھی ہوکر گھر لوٹو گی تو اس کی خوشبو سے تمہارا گھر مہک اُٹھے گا۔ گھر کی ہر اینٹ سے خوشی چھلکے گی، ہمارا ننھا سا گھر خوشیوں کا گہوارہ ہوگا۔"

''اور اگر ایسا نہیں ہوا تو۔''؟

''پمی کے ڈیڈی کانپ گئے۔'' نہیں سنتھیا ایسا نہیں ہوسکتا، اگر خوشبو ہوا میں کھوگئی، اگر پیار زہر بن گیا تو ہمارا ننھا سا گھر تباہ ہوجائے گا۔ سنتھیا ہم برباد ہوجائیں گے''۔ اور مرینا جب وہ لوگ چلے گئے تو سنتھیا نے مجھ سے کہا۔ ''نرس یہ ننھا سا گلاب ہوسپٹل کی فضاؤں سے دور تم اسے اپنے کمرے میں لے جاؤ اس میں میری بچی کی سانس بسی ہے، گھر کا پیار بسا ہے، میں نہیں چاہتی کہ مریضوں کے سارے درد اس میں شامل ہوجائیں، میری کراہیں اس میں رچ جائیں، اور ایوڈین، اسپرٹ اور برتن میں رکھے ہوئے آپریشن کے اوزاروں کی خوشبو اس میں بس جائے، اس گلاب کو تم لے جاؤ نرس! مجھ سے دور''۔ اتنا کہتے کہتے لینا کا حلق سوکھنے لگا۔!

''لینا۔؟''

''ہاں! تیری گود میں بھی گلاب کھل سکتا ہے اس لئے میں کہتی ہوں کہ تو پیاسی ہے۔ صرف پیار کی پیاس ہے۔ اچھا آئندہ اتوار کو چرچ میں تیری ملاقات ماسٹر کی ٹریننگ پانے والے کسی نہ کسی لڑکے سے......!''

لینا بپھر اُٹھی۔ چپ رہ مرینا۔! لینا اتنی گری ہوئی نہیں جو اپنی پیاس بجھانے کے لئے نالی کا گندہ پانی پی لے۔ وہ پیاسی مر جائے گی لیکن ان لڑکوں کی طرف ایک نظر بھی نہیں دیکھ سکتی، سمجھی۔ یہ مرد نہیں ہیں مرینا۔ یہ مجھ جیسی کمزور عورت کا سہارا دینے والے مضبوط بازو نہیں ہیں۔ یہ تو خود محتاج ہیں۔ مشن کی روٹیاں کھانے والے۔ کیا کوئی ان سے شادی کرنے کو تیار ہوگا؟ ہرگز نہیں۔ اگر یہ جوان مضبوط ہوتے تو مشن میں لڑکیوں کا دم کیوں گھٹتا''۔ اور پھر لینا سسکنے لگی۔

ایوننگ پریئر مریضوں کے ساتھ ہوتی تھی اور اس پریئر میں مسیحیت کے گیت گائے جاتے تھے۔ گیت شروع کرنے والی لینا ہی ہوتی تھی۔ لیکن جب اس سے کہا گیا

کہ وہ آج یہ گیت ''مجھ میں عیسو کی پر چھائیاں دکھائی دے'' گائے تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک دوسری لڑکی نے اس گیت کو اُٹھایا اور اس گیت میں مشن میں تعلیم پانے والی وہ سب نرسیں شامل ہو گئیں۔ لیکن لینا ہی ایک ایسی لڑکی تھی جو آخری وقت تک خاموش رہی۔ گیت ختم ہونے پر پادری صاحب نے کہا۔ ''اس دُنیا کی فکر نہیں کرنی چاہیے بلکہ اُس دُنیا کی فکر کرنی چاہیے جو عیسیٰ مسیح نے ہم لوگ کے لئے ایک پاک صاف دُنیا بنائی ہے''۔ اس آخری جملے پر لینا چونک اُٹھی، اس کی آنکھوں کے سامنے سنتھیا کے شوہر کی تصویر گھوم گئی۔ ''جب تم اچھی ہو کر گھر لوٹ آؤ گی تو پیار کی خوشبو سے سارا گھر مہک اُٹھے گا، گھر کی ہر اینٹ مسکرائے گی۔'' جب روم میں مرینا نے کہا تم پر کبھی کبھی پاگل پن کا دورہ کیوں آجاتا ہے تو صحیح معنوں میں لینا پر پاگل پن کا دورہ آگیا۔ وہ چیخ پڑی ---نہیں۔ نہیں۔ کبھی نہیں گاؤں گی، پریئر، مارننگ پریئر، ڈے پریئر، ایوننگ پریئر اور پھر اب ذرا دیر میں نائٹ پریئر میں جانا ہوگا۔ اس سے میں تنگ آگئی ہوں، یہ پادری لوگ جھوم جھوم کر گاتے ہیں۔ مجھ میں عیسو کی پر چھائیاں دکھائی دے۔'' مگر مرینا تم جانتی ہو ان میں شیطان کی پر چھائیاں دکھائی پڑتی ہیں۔ ہمارے اسپتال میں رات دن دعائیں ہوتی ہیں۔ مریضوں کو نرسوں سے گیت سنوائے جاتے ہیں لیکن یہ سب فریب ہے۔ یہ سب دھوکا ہے۔ یہ پادری لوگ بے رحم اور کھوکھلے ہوتے ہیں۔ غریبوں پر رحم کرنا نہیں جانتے، اب تو ہی بتا، میں کیوں راگ چھیڑوں۔'' اسی وقت مرینا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''چپ بھی رہ، جو منہ میں آتا ہے بک جاتی ہے۔ ابھی ادھر سے کوئی گزرا ہے۔''

''تو کیا ہوا، یہ پادری لوگ ہم سب کی نیت پر شک کرتے ہیں' یہ برابر چھپ چھپ کر ہم لوگوں کی باتیں سنتے ہیں' اور پریئر میں کہتے ہیں کہ ''یقین انسان کی سب سے بڑی پونجی ہے'' تو پھر یہ لوگ ہم سبھوں پر یقین کیوں نہیں کرتے۔''

اور دوسرے دن لینا کو نوٹس ملی۔ ''مشن میں زہریلی بات پھیلانے کے جرم میں پندرہ دنوں کے روپئے کاٹ لئے گئے ہیں اور پھر ایسی حرکت سرزد ہونے پر مشن سے نکال دیا جائے گا۔''

شام کو سسٹر نے کہا---''لینا! لڑکوں کے سیکشن میں ایک لڑکا بیمار ہے، آج رات تم اسی روم میں ڈیوٹی دینا، روم نمبر ۳ ہے۔''

''جی اچھا،'' اور لینا چلی گئی۔

تقریباً آدھی رات کو لینا دوڑتی ہوئی اپنے روم میں واپس آ گئی تھی، مرینا گھبرا کر پوچھ بیٹھی ''تجھ کو کیا ہوا ہے؟'' لیکن لینا بالکل خاموش رہی۔ صبح جب سسٹر نے لینا سے جواب طلب کیا تو اس نے صرف یہی کہا ''میم صاحب! ریجن اچھا لڑکا نہیں ہے۔''

سسٹر غصہ سے بے قابو ہو گئی اور کہا ''خراب لڑکی، ریجن ماسٹر ایڈورڈ کا لڑکا ہے، شریف باپ کا شریف لڑکا، یہاں وہ ماسٹر بننے آیا ہے اور تم اس پر یہ الزام لگاتی ہو، جیسی خراب تم ہو ویسا ہی سب کو سمجھتی ہو، جب تک ریجن اچھا نہیں ہوتا اس وقت تک نائٹ ڈیوٹی اس کے روم میں رہے گی، اگر پھر تم بھاگ آئی تو میں تمہیں اس مشن سے ہمیشہ کے لئے باہر کر دوں گی۔ گیٹ آؤٹ۔''

لیکن رات میں لینا کسی طرح بھی ڈیوٹی پر جانے کو تیار نہیں تھی اور مرینا یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر لینا نہیں گئی تو صبح اسے مشن سے نکال دیا جائے گا۔ اس نے لینا کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میری اچھی لینا! تجھے میری قسم تو ڈیوٹی پر چلی جا، اگر تو نہیں گئی تو کل تجھے.........اور پھر تمہاری ٹریننگ بھی پوری نہیں ہو سکے گی اور تیری ماں بھی تو بہت غریب ہے۔ اور لینا کی آنکھوں میں اپنی بوڑھی کمزور ماں کی تصویر گھوم گئی جس نے غریبی اور بھوک سے ہار کر اپنی پیاری بچی کو مشن میں داخل کر دیا تھا۔ لینا یک بیک اُٹھ کر ریجن کے روم کی طرف چلی گئی۔

پہلی صبح وہ ڈیوٹی سے آ کر بہت روئی، دوسری صبح درد میں کچھ کمی ہوئی۔ تیسری رات جب روشنی بجھا رہی تھی تو اس وقت دیوار پر لٹکی ہوئی میرؔی کی گود میں بے بی کرائسٹ ہنس رہا تھا،...... ''نہیں ---- ریجن --نہیں۔ کہیں میں میرؔی بن گئی تو'' اس کے ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے اور اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ ریجن نے روشنی بجھاتے ہوئے کہا'' پگلی! اگر تو میرؔی بن گئی تو میں جوجن بن جاؤں گا۔ تیرے ہی لئے تو بیماری کا یہ ڈھونگ رچا رکھا ہے، میرے اوپر یقین کرو، میں تجھے کبھی نہیں بھولوں گا، میرے اوپر بھروسہ کر و لیناؔ۔''

اور لیناؔ بہت خوش تھی۔ دن گزرتے گئے۔ بہت دن گزر گئے۔

ایک صبح مارننگ پریئر کے بعد جب لیناؔ اپنی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر لمبے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی تو اچانک اس کی نظر کھڑکی کے باہر ایک ٹانگہ پر پڑی۔ اسی وقت مرینا باہر سے دوڑتی ہوئی آئی اور کہا'' لیناؔ.... لیناؔ..... لیناؔ۔''

لیکن اس کے کہنے کے قبل ہی اس نے پوچھا--- ''مرینا-- ! یہ ٹانگہ کس لئے یہاں آیا ہے؟''

ایڈورڈ پاؤل انگلینڈ جا رہے ہیں اور ان کے ساتھ ریجن بھی جا رہا ہے۔ ریجن نے شکایت کی ہے کہ یہاں کی چند نرسوں کے کردار اچھے نہیں ہیں۔ اس لئے اس کا یہاں سے چلا جانا بہتر ہے ریجن کے کردار کے متعلق مشن کے تمام لوگ تعریف کے پل باندھ رہے ہیں۔ لیناؔ یہ سن کر سکتے میں آ گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ بہت اونچائی سے گر پڑی ہو۔

مرینا نے کہا۔ ''لیناؔ! کیا سوچ رہی ہے جلدی سے اپنا'' بلیک ڈریس'' نکال لے، بیڈ نمبر گیارہ کی مریضہ مر گئی ہے۔ لیناؔ یہ سن کر کانپ گئی۔ ''سنتھیا-- سنتھیا-- مر گئی'' اس نے میز پر سوکھے ہوئے گلاب کے پھول کی طرف دیکھا۔ نہ جانے کب اس کی پنکھڑیاں جھڑ گئی تھیں، صرف تنکا رہ گیا تھا-- لیناؔ کی تصور میں چھوٹی ممی، اس کے ڈیڈی اور اس کی ماں سنتھیا کے عکس یکے بعد دیگرے ابھرنے لگے۔ ''اگر میں نہیں آ سکی تو.....؟''

''نہیں، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر خوشبو فضا میں گم ہوگئی تو تمی کا پیار زہر بن جائے گا۔ گھر کی ہر اینٹ رونے لگے گی، اور چھوٹا سا گھر برباد ہو کر رہ جائے گا۔''

لینا جب ''بلیک ڈریس'' زیب تن کئے باہر آئی تو تانگا اس وقت دور جا چکا تھا، وہ خاموش کھڑی رہی اسے اس وقت ایسا لگا جیسے چاروں طرف سے آوازیں آ رہی ہیں۔ سارا مشن چیخ رہا ہے۔ ''خراب لڑکی، بدمعاش لڑکی، پاپی، گیٹ آؤٹ۔''

کہانی کا بقیہ حصہ پھٹا ہوا تھا۔ لیکن ویرا کے آنسو اس نامکمل کہانی کو پڑھ کر تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے اسی وقت ایک کمزور بوڑھی عورت کمرے کے اندر آئی، اس نے دیکھا کہ اس کا بکس کھلا ہوا ہے کپڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں اور ویرا کے ہاتھوں میں ایک کاغذ ہے۔

''بیٹی، تو کب مشن سے آئی؟''

''ابھی آئی ماں---!''

''ماں! کیا اس کہانی کا آخری حصہ کسی چوہے نے کتر دیا ہے؟''

''کیوں؟''

''یہ میری کہانی ہے ماں! غریبی سے تنگ آ کر تم ہی نے تو مجھے مشن میں داخل کیا تھا۔''

لینا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''نہیں، میری بچی! یہ میری کہانی ہے-!!!''

☆☆☆

نئی کرن

چین سے سو رہا تھا کہ اچانک دروازے پر چند ہاتھوں کی تھپتھپاہٹ سنائی دی، تھپتھپاہٹ جو بھڑ بھڑاہٹ سے زیادہ قریب تھی۔

''آپ لوگ کون ہیں؟'' دروازہ کھولنے کے بعد پوچھا۔

''ہم لوگ کالے کتے ہیں-- کاٹنے آئے ہیں۔

''مگر کیوں؟''

کالے کتے مجھے پیچھے ڈھکیل کر اندر لے آئے اور کمرے میں زبردستی بیٹھ گئے۔وائف آواز سن کر اُٹھ بیٹھی تھی۔اس نے خوف زدہ لہجے میں مجھے اندر بلا کر پوچھا ---''یہ کون ہیں---؟''

''کالے کتے ہیں--؟'' میں نے کہا۔

''مگر رات کے بارہ بجے یہاں کیوں آئے ہیں---؟''

''کہہ رہے ہیں کاٹنے آئے ہیں---!''

کمرے میں غراہٹ تیز ہوگئی تھی،اس لئے فوراً کمرے میں واپس آ گیا۔

''کیا نقصان ہوا ہے آپ کا---؟''

''آپ نے سیاہ بسکٹ لینے سے انکار کر دیا ہے۔۔۔؟''

''ہاں! ایسا کرنے سے آپ لوگوں کا کوئی نقصان تو نہیں ہوا۔۔؟''

''بکواس کرر ہے ہیں۔۔۔''

''عجیب بات ہے۔کیا کسی سے سیاہ بسکٹ نہیں لینا بھی جرم ہے؟''

''کیا آپ اپنے آفس میں ایک افسرانہ رعب نہیں رکھتے۔؟

''یہ تو میری کرسی پر منحصر ہے۔ہوسکتا ہے آپ لوگوں کو غلط فہمی ہو گئی ہو۔۔؟

''بکواس مت کرو۔۔!''

''ہم تین مرتبہ دیکھ چکے ہیں آپ نے ہم لوگوں سے سیاہ بسکٹ لینے سے انکار کر دیا ہے۔آپ کے اندر پختگی ہے۔''

''آپ کے چہرے پر سچائی کی لکیریں ہیں۔''

''لیکن ایک جمہوری حکومت کے افسر کے لئے یہ سب باتیں بہت ضروری ہیں ۔کیونکہ اپنے وطن کی ترقی اس کے ہاتھ میں ہے۔ویسے ہر انسان کو اپنے اپنے اصول اور طور وطریقے سے جینے کا حق ہے۔۔۔!''

''آپ غرور اور گھمنڈ میں کہہ رہے ہیں۔۔''

''میں نے کب کہا کہ مجھے اپنے جیسا کالا کتا سمجھئے۔۔۔ میرا اصول اور طور و طریقہ آپ سے نہیں دیکھا جاتا تو مجھے نظر انداز کیجئے۔اور اپنے کالے دھندے کو سفیدی میں بدل کر عزت سے زندگی گزاریئے۔کیوں میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔۔''

''نہیں۔۔۔یہ سب نہیں چلنے دیا جائے گا۔۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگ سے سمجھوتہ کرنا ہوگا۔۔''میں نے کہا۔

''ہاں!۔۔۔''

''آخر کیوں؟---''

''اس لئے کہ ہم لوگ کہہ رہے ہیں----!

''مگر آپ کون ہیں--؟''

''ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ کالے خوفناک کتے ہیں---''

''کیا اور بھی کسی دوسرے افسر سے سمجھوتہ کیا تھا---؟''

''جی ہاں! آپ کے قبل جو بھی افسر آئے سبھی ہم لوگ سے سمجھوتہ کر لیتے تھے ---لیکن آپ کی چال ڈھال ناپسندیدہ اور نا قابل برداشت ہے--''

''آپ لوگ ابھی جائیے۔ مجھے چین سے سونے دیجئے۔''میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ٹھیک رات کے دو بج رہے تھے۔

''جو ہم لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے اسے کبھی بھی چین نہیں لینے دیتے۔''

''اگر آپ لوگوں کی نظروں سے دور ہو جائیں تو---؟''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے جبکہ ہم لوگ چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ جب تک آپ جیسے اصول پرست زندہ رہیں گے۔ ہم دونوں کے درمیان جنگ برابر ہوتی رہے گی---''

وقت بالکل خاموش تھا اور کبھی کبھی یہ خاموشی ڈرا بھی دیتی تھی----

میں نے کہا---''کیا آپ لوگ مجھے سوچنے کا موقع دیں گے---؟''

''ٹھیک ہے صبح تک سوچئے، لیکن اس کے درمیان آپ باہر نہیں نکل سکتے۔ ہاں! اگر آپ چاہیں تو چھت سے رسی لگا کر خودکشی کر سکتے ہیں، ہم سیاہ رسی دے جائیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ لوگ باہر چلے گئے۔

جانے کے وقت میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں خوف ناک اور لال

تھیں، ناخن بڑے بڑے تھے اور خونخوار دانتوں کے درمیان زبان لٹک رہے تھے، اسی وقت دو سائے میرے گھر کے ایک گوشے سے دوسری طرف چلے گئے۔

وائف فوراً دوڑ کر لپٹ گئی۔ اور کہا ''یہ لوگ کیوں ستا رہے ہیں؟''

''ان کی مرضی۔''

''کیا چاہتے ہیں یہ آپ سے؟''

''وہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں ان سے سمجھوتہ کرلوں۔''

''لیکن آپ کی لڑائی ایک اصول کی لڑائی ہے۔ ایک آدرش کی لڑائی ہے۔ جو ان لوگوں سے ہی ہے۔ پھر آپ سمجھوتہ کیسے کریں گے؟''

''کرنا ہوگا'' ---ورنہ یہ لوگ مجھے چباڈالیں گے۔ یہ تعداد میں زیادہ ہیں۔ تاریخ گواہ ہے، جو ان کے سامنے نہیں جھکا، اسے انہوں نے نوچ کھایا ہے۔ تباہ کردیا ہے!''

''یہ آپ کا ضمیر نہیں بلکہ یہ آپ کا خوف بول رہا ہے۔ کیا آپ اس ملک کی نئی کرن کو اندھیروں کا لقمہ بنا دینا چاہتے ہیں؟ کیا آپ میں ان سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔؟ کیا آپ بالکل بزدل ہوگئے ہیں۔؟ آپ اتنے خوفزدہ کیوں ہیں۔؟''

''میرے بازو میں طاقت ہے۔ لیکن میں اکیلا ہوں، ان کے ساتھ سبھی کالے کتے ہیں۔ اور کالے کتوں کے سیاسی دوستوں کی کمی نہیں----!''

''نہیں۔ نہیں--اب وقت گزر گیا۔ ان کے سارے سیاسی کالے دوست روپوش ہوچکے ہیں۔ اب یہی وقت ہے۔ اب ہمت سے کام لیجئے۔ کالے کتوں کی طاقت کو توڑ دیجئے، اب آپ کے چاروں طرف طاقت ہی طاقت ہے۔ اب ان کا کوئی ساتھ نہیں دے گا۔ ان کا چہرہ کھل کر سامنے آگیا ہے۔ کتے آخر کتے ہیں۔ ان کی

طرفداری کوئی نہیں کرے گا۔ہاں۔اگر آپ کو سمجھوتہ کرنا ہے تو پھر اپنے اصول سے سمجھوتہ کیجئے---زندہ یا مردہ---"

قریب سے آواز آئی۔"ہاں۔اب ایسا ہی ہوگا---!"

اور دوسرے دن اصول،فرض کی کرسی پر شان سے بیٹھا تھا۔سامنے ایش ٹرے پر کالے کتوں کے زہریلے دانت ٹوٹے ہوئے پڑے تھے۔افسر کی بیوی اور سچائی مسکراتی ہوئی سامنے لگے قد آدم سے باہر آئی اور افسر کا قلم فائل پر تیزی سے چلنے لگا---!!!

☆☆☆

تخلیق کا کرب

میری بیوی تقریباً دو گھنٹے سے تخلیق کے کرب میں مبتلا ہے۔ وہ درد سے کراہ رہی ہے۔ مگر میں کیا کرسکتا ہوں، میرے گھر میں محلے کی کچھ بوڑھی اور تجربہ کار عورتیں جمع ہیں۔ وہ سب اپنے اپنے طور پر تدبیروں میں لگی ہیں تاکہ میری بیوی کو تخلیق کے کرب سے نجات دلا سکیں.................اور میں جو اردو زبان و ادب کا مایہ ناز افسانہ نگار ہوں سر جھکائے بیٹھا سوچ رہا ہوں اور دل ہی دل میں خدا سے دعا بھی کرتا جارہا ہوں کہ جلد اور آسانی سے ولادت ہوجائے...............مگر ولادت کے فوراً بعد تو بچہ کے لئے دودھ چاہئے اور پھر بچہ کی ماں کے لئے بھی کھانے کو کچھ چاہئے۔ اور آج میرے گھر میں کچھ نہیں ہے۔ گرچہ میں خود بھی بہت بھوکا ہوں.......لیکن بھوک کا احساس ختم ہوگیا ہے..........میں فی الحال صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ پیسہ کا بندوبست کہاں سے کروں؟..........کس سے قرض مانگوں........؟ مگر کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ یک بیک میرے سوچوں کا سلسلہ درہم برہم ہوگیا۔

میرے سامنے کھڑی میری بوڑھی پڑوسن مجھ سے کہہ رہی ہے..........بیٹا! اسے اسپتال لے جاؤ۔ ہم لوگوں کی تمام تدبیریں ناکام ہوگئیں..........!!

اور مجھے ایسا لگا.........جیسے میرے کانوں میں گرم گرم سیسہ ڈال دیا ہو..........
یا پھر میرا داغ اپنے مرکز سے کھسک گیا ہو۔ میں گھبراہٹ میں فوراً گھر سے باہر

آ گیا۔ میرے ساتھ ساتھ وہ بوڑھی پڑوسن بھی دروازے تک آئی.........پھر مجھے عجیب نظروں سے دیکھتی ہوئی کچھ سوچ کر واپس لوٹ گئی۔............مگر میں اتنی رات گئے ں کا دروازہ کھٹکھٹاؤں ۔اسی کشمکش میں مبتلا اپنے ایک دوست کے دروازے تک پہونچ گیا جو اسی محلے میں رہتا ہے۔وہ بھی میری طرح کہانیاں لکھتا ہے۔ وہی اس کا ذریعۂ معاش ہے۔مگر وہ ہندی زبان کا افسانہ نگار ہے.........!!

وہ خود ہی دروازہ کھولتا ہے۔اور اتنی رات گئے مجھے اپنے دروازے پر دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ دریافت کرتا ہے، کیا بات ہے............؟

''ارے یار.......! کچھ پیسے ہوں تو اس وقت کام چلادو۔بیوی کو ہاسپٹل لے جانا ہے اور میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے.....اور میں ....!!''میں ایک سانس میں سب کچھ کہہ جاتا ہوں۔وہ خاموشی سے اندر جاتا ہے اور ایک بیس روپئے کا نوٹ میری ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے.......میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔مگر زبان ساتھ نہیں دیتی.............صرف تشکر آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہوں ۔اور واپسی کے لئے مڑ جاتا ہوں............!!

میں ہاسپٹل میں تقریباً چار گھنٹوں سے لیبر روم (Labour Room) کے باہر ایک بوسیدہ اسٹول پر بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ واقعی عورت خدائے تعالیٰ کی شاہکار تخلیق ہے.........کتنا جابر و شاکر.....زندگی میں ہر ہر مرحلے پر، ہر ہر قدم پر کتنا دکھ اٹھاتی ہے ....اقبالؔ نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا۔ ''وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ'' لیکن آج کی مہذب اور ترقی یافتہ دنیا میں عورتوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھ رہی ہے۔اور اسے آزادئ نسواں کا خوبصورت نام دے کر عورتوں کو ورغلا رہی ہے اس کو کیا نام دیا جاسکتا ہے.............اور کیا ہم............''

اسی درمیان ایک نرس آکر مجھے پرزہ تھما دیتی ہے............ ''اے مسٹر! یہ دوا جلد لے آیئے، اور پھر واپس لیبر روم میں چلی جاتی ہے۔ میں خاموشی سے وہاں سے باہر آجاتا ہوں۔ نہ جانے اس دوا کی کیا قیمت ہو....؟ جیب میں پڑا صرف دس روپے کا نوٹ کلبلا رہا تھا........ خیر کہ وہ دوا سستی ہی تھی............ مگر اور دواؤں کی ضرورت پڑی تو.......... یہ سوچ کر میں اداس ہوگیا............ لیکن ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندی........ وہ ایک مشہور و معروف پبلشر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

پبلشر نے اسے دیکھتے ہی بڑی خوشی اور مسرت کا اظہار کیا۔

''آیئے آیئے، فرحت صاحب تشریف رکھئے۔ کیسے کیسے اس غریب خانے کو آپ نے رونق بخشی........ کہیئے میں کیا آپ کی خدمت کرسکتا ہوں..........؟''

دوسرا کوئی موقع ہوتا تو مجھے اس کی اس چاپلوسی پر سخت غصہ آجاتا۔ اور میں فوری طور پر واپس لوٹ آتا۔ کیونکہ مجھے اس بے جا تصنع سے سخت کوفت ہوتی ہے۔ مگر میں تو اس وقت سب کچھ برداشت کرسکتا تھا........''

میں نے بڑی آہستگی سے کہا۔ دیکھئے میں اس وقت ایک بہت ہی ضروری کام سے آیا ہوں۔

''فرمایئے، فرمایئے........ زہے قسمت..........''

دیکھئے مجھے اس وقت فوری طور پر کم از کم دو سو روپے کی سخت ضرورت ہے۔ میری بیوی ہاسپٹل میں پڑی تڑپ رہی ہے..........

دو سو روپے یکمشت......... پبلشر کا چہرہ سخت اور کھردرا ہو چکا تھا........ پھر بھی اس نے کہا۔ دیکھوں مسودہ........ آپ کیا لائے ہیں؟

مسودہ تو میں لایا نہیں ہوں اور نہ کوئی مسودہ میرے پاس موجود ہے۔ البتہ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک ہفتہ کے اندر دس افسانوں پر مشتمل ایک مسودہ آپ کو

دے دوں گا۔

دیکھئے....! فرحت صاحب تب تو بڑی مشکل ہے، اس کا لہجہ سخت اور جذبات سے بالکل عاری تھا۔ میں اس وقت دوسو روپے تو نہیں دے سکتا۔ البتہ پچیس، تیس سے کام چلے تو حاضر ہوں........"

میرا تو جی چاہا کہ ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کر دوں.......... یا کم از کم اسے بہت برا بھلا کہو؟ جس نے ایک فن کار کو ذلیل و رسوا کیا ہے.......... مگر مجھے میری بیوی کے مسلسل کراہنے کی آواز میری روح میں حلول کرتی محسوس ہوئی..........."

"ٹھیک ہے دیوان صاحب کم از کم پچاس دے دیجئے.......!"

دیوان صاحب نے مسکراتے ہوئے پچاس روپئے کا ایک نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا.......... دیکھئے اپنا وعدہ یاد رکھئے گا۔ اور جلد سے جلد مسودہ بھجوا دیں گے.......؟

اور پھر جب میں ہاسپٹل پہونچا تو نرس شائد میری ہی تلاش میں تھی۔

"او مسٹر! آپ کدھر چلا گیا تھا؟ میں کتنی دیر سے آپ کو تلاش کر رہی ہوں۔ جائیے جلدی سے یہ انجکشن لے کر آیئے!"

میں دوڑتا ہوا دوا لانے چلا گیا۔

اور اب پھر لیبر روم کے باہر بوسیدہ اسٹول پر بیٹھا خاموشی سے ہر آنے جانے والے چہروں کو تک رہا ہوں۔ اب تک وہاں ایک اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو چکی ہے....... جس میں کچھ عورتیں بھی ہیں..... مرد بھی..... بوڑھے بھی.......... جوان بھی........ بچے بھی....... مگر ہر شخص کے چہرہ پر ایک سوالیہ نشان نمایاں تھا.......... کچھ کے چہروں پر گھبراہٹ....... کچھ مطمئن....... کچھ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے.......... کچھ لوگ اضطراب کی حالت میں ٹہل رہے تھے.......... کچھ لوگ خاموشی سے ایک دوسرے

کا منہ تک رہے تھے.........اور جب بھی کوئی سسٹر لیبر روم سے باہر آتی تو ہر شخص لپک کر اس سے اپنی خوشی جھپٹ لینا چاہتا تھا.........میں بہت دیر تک بیٹھا یہ تماشا دیکھتا رہا.........یک بیک میرے ذہن میں پبلشر کا کہا جملہ گونجنے لگا۔ ''مسودہ جلد بھجوا دیں.........مسودہ جلد بھجوادیں.........'' میں نے سوچا اتنے سارے چہروں میں سے کسی چہرہ پر افسانہ کیوں نہ تلاش کروں.........میں نے افسانے کی تلاش میں ذہن کو کسی ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کی کوشش شروع کردی.........میں خود بھی اپنی بیوی کی طرح تخلیق کے کرب میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ مگر مجھے تو دس افسانے بہر حال لکھنے ہیں.........وعدہ تو پورا کرنا ہی ہے.........میں سوچ رہا ہوں کہ کیا اپنے ڈاکٹر دوست کا افسانہ لکھوں جو شادی شدہ ہے۔ اور دو بچوں کا باپ ہے۔ مگر پھر بھی ایک نرس مارگریٹ سے محبت کرتا ہے اور وہ چاہتا بھی ہے کہ اس کی زندگی پر ایک افسانہ لکھوں.....!.........یا پھر میں اس عورت کو اپنے افسانہ کا موضوع بناؤں جسے بہت قریب سے جانتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک اس کا شریف شوہر زندہ تھا۔ وہ بھی بہت شریف تھی۔ پردے کی پابند تھی.........مگر جیسے ہی اس کے شوہر کا انتقال ہوا اس نے ایسے بال و پر نکالے کہ بس توبہ ہی بھلی۔ اس سے تو کہیں بہتر کوئی پر کٹی کبوتری ہوگی۔ حالانکہ وہ دو جوان بیٹوں کی ماں بھی ہے۔

یا پھر میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میں اس پڑوسن کی کہانی لکھوں جس کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ صرف ایک بیٹی ہے۔ جو شادی شدہ ہے۔ مگر اکثر اپنے میکے ہی میں رہتی ہے۔ یہیں اس کا داماد بھی رہتا ہے۔ حالانکہ سنتا آیا ہوں کہ سسرال والے امیر وکبیر ہیں۔ اور شریف ہیں۔ اس کے باوجود ''کانتی'' (پڑوسن کی لڑکی کا نام) سسرال نہیں جاتی۔ یا شاید اس کی ماں اسے سسرال نہیں جانے دینا چاہتی.........نہ جانے دونوں میں کون سی بات صحیح ہے.........لیکن یہ حقیقت ہے کہ ۲۴ گھنٹے کے درمیان ۱۸ گھنٹے کا

ساس اور داماد میں مہابھارت کا منظر ہوتا ہے۔ جس میں کبھی کبھی کانتی بھی شریک ہوتی ہے۔ کبھی ماں کی موافقت میں اپنے شوہر سے لڑتی ہے۔ گالیاں دیتی ہے.........اور کبھی شوہر کی طرف داری میں اپنی ماں سے لڑتی جھگڑتی ہے.........ان تینوں کے جھگڑے میں کبھی کبھی کانتی کا باپ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ جو ایک پیر کا اور کمزور ونحیف آدمی ہے۔ ان لوگوں کی لڑائی کی شروعات بڑی عجیب وغریب ڈھنگ سے ہوتی ہے.........پہل ہوتی ہے داماد اور ساس سے.........پھر اس ڈرامے میں کانتی کا رول اجاگر ہوتا ہے.........اور اس کا باپ......مگر اس بوڑھے کی ملوث ہوتے ہی، سب کے سب اسی بوڑھے پر یلغار کر دیتے ہیں۔ پھر اس طوفان بدتمیزی میں یہ تمیز کرنا بڑی مشکل ترین مرحلہ ہے کہ کون کس کو گالی دے رہا ہے۔ حالانکہ وہ لوگ ذلیل ترین گالیوں کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں۔ ڈرامہ کا ''ڈراپ سین'' ان لوگوں کے تھک جانے کا غمازی کرتا ہے.........لیکن یہ بھی میرے افسانے کا موضوع نہیں بن سکتا.......تب پھر کیوں نہ میں اس شخص کی کہانی لکھوں جو اپنی سوتیلی ماں سے بات بات پہ جھگڑے کرتا ہے۔ اور بہت ہی نالاں رہتا ہے۔ حالانکہ اس کی سوتیلی ماں اسے بہت زیادہ پیار ومحبت دیتی ہے۔ اس نے اس کی پرورش کی ہے.........مگر کہلائے گی تو آخر سوتیلی ماں!.........لیکن میں اگر اس کہانی میں اپنی ماں کی کہانی شامل کر دوں جو میری اپنی سگی ماں ہے۔ اور میں اس کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اس طرح میری بیوی اس کی واحد بہو ہے۔ مگر میری ماں میری بیوی کے ساتھ۔ یا خود میرے ساتھ ایسا برتاؤ جائز رکھتی ہے کہ سوتیلی ماں بھی ایسا برتاؤ نہیں روا رکھتی ہوگی۔ مگر میں کیا کروں.........کس سے کہوں.........میں اپنا دکھ کسی سے کہنے کا عادی نہیں ہوں۔ پھر بھی جب کبھی اس کا تذکرہ کسی سے کرتا ہوں تو کوئی شخص یقین نہیں کرتا کہ اپنی سگی ماں ایسا کرتی ہوگی۔ میں خود بھی کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیا یہ سچ مچ میری ماں ہے؟ اس نے مجھے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے.........؟ مگر تمام سوالات کے

جوابات اثبات میں ہوتے ہیں، اور میں دنیا کی ایسی واحد ماں پاکر خوش ہولیتا ہوں.........اور......!!

''اے مسٹر!.........مٹھائی کھلاؤ..........تمہیں لڑکا مبارک.........اور تمہاری وائف (بیوی) کووارڈ نمبر L (ایل) میں بیڈ نمبر ۴ پر پہنچادیا گیا ہے۔''

''تھینک سسٹر.......تھینک یو.........''اور میں بڑی تیزی سے وارڈ کی طرف دوڑ پڑتا ہوں.........!!

☆☆☆☆

اسے کیا کہیں گے

''کوئی شخص میرا مطلب ہے کوئی شریف آدمی کسی لڑکی کو خبیث کیسے کہہ سکتا ہے۔'' چھوتے قد کے آدمی نے سب کو چیلنج کیا۔ اور اطمینان سے لیمونیڈ پینے لگا۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ وہ لوگ اس قسم کے چیلنج کے عادی ہوتے جارہے تھے۔

''میں پھر کہتا ہوں، میرے سامنے اس نے لڑکی کو خبیث کہا، بدتمیز یا بے رحم کہتا تو کوئی بات نہ تھی، مگر اس نے خبیث کہا۔ میں کہتا ہوں، یہ بات مردانگی سے بعید ہے کہ کسی لڑکی کو خبیث کہا جائے۔''

ڈاکٹر ڈاسن پائپ کا کش کھینچنے لگا۔ میتھوزا اپنے دونوں گھٹنے ہاتھوں کے حلقے میں لئے بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ سوئٹ اپنے اسکاچ کا گلاس ختم کرچکا تھا۔

''مسٹر ٹروکر! میں پوچھتا ہوں کہ کیا کسی لڑکی کو خبیث کہنا جائز ہے''۔؟

ٹروکر اس کے برابر بیٹھا تھا وہ اس سوال سے ہڑبڑا کر بولا۔ ''یہ بات تو لڑکی پر منحصر ہے''۔

چھوٹے قد والا آدمی حیران ہوکر بولا۔ ''آپ کا مطلب ہے۔''؟

''میرا مطلب ہے کہ میں نے ایسی لڑکیاں و عورتیں دیکھیں ہیں جو کسی خبیث سے بھی بدتر ہوتی ہیں۔'' اس جواب سے سناٹا چھا گیا۔

چھوٹے قد والا اس جواب کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر کرب نمایاں تھا۔

''تمہیں کسی شخص کا، کسی لڑکی کو خبیث کہنا اتنا برا لگ رہا ہے''۔ ٹروکر سرد لہجے میں بولا۔ ''میں تم کو ایک خاتون میرا مطلب ہے ایک لڑکی کے بارے میں بتاتا ہوں۔

فرض کرلیں اس کا نام مس کروتھر تھا۔ جب میں قصہ ختم کرلوں تو تم سے پوچھوں گا کہ وہ خبیث سے بدتر تھی یا نہیں؟ یہ بہت دنوں کی بات ہے جب ایچ۔اینڈ۔او لائن کے جہاز چلتے تھے۔ہم اور وہ ایک ہی جہاز پر لندن سے مشرق بعید کے لئے سفر کررہے تھے۔''اس نے رُک کر گلا صاف کیا اور بات جاری رکھی۔

''مس کروتھر ایک حسین و نازک سی جوان لڑکی تھی۔ اس کا باپ مشرق بعید میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھا۔ اس کا اصلی نام اگر لوں تو تم سب فوراً پہچان جاؤ گے۔ وہ لڑکی اپنی ماں اور خادمہ کے ساتھ اپنے باپ کے پاس جارہی تھی۔ اس نے دوسرے مسافروں کو حیران کر رکھا تھا۔ وہ تقریباً سارے کھیل اچھی طرح کھیل سکتی تھی۔ اچھا خاصا گانا بھی گالیتی تھی۔ جہاز کی ساری دوسری خواتین سے اچھا رقص کرتی تھی۔ تیرنے میں تو اس نے لڑکیاں تو لڑکیاں مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اسے کپڑے پہننے کا ڈھنگ آتا تھا۔ معمولی لباس میں بھی وہ دلکش نظر آتی تھی۔ گاتی یا رقص کرتی تو ماہر آرٹسٹ لگتی تھی۔ جب وہ کوئی اچھا لباس پہنتی تو ماڈل لگتی تھی۔''

سب لوگ بڑی توجہ سے ٹروکر کی بات سن رہے تھے۔ جو کہہ رہا تھا'' وہ جسمانی طور پر ایک تندرست لڑکی تھی۔ مگر جس چیز نے سب کو حیران کررکھا تھا۔ وہ اس کا تیرنا تھا کہ اس کے تیرنے میں ایک نفاست ایک نزاکت تھی۔ وہ مچھلی کی طرح تیرتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے کوئی محنت نہیں کرنی پڑرہی ہے۔ وہ پانی کا ایک حصہ ہو جیسے وہ پانی میں پیدا ہوئی ہو، جب وہ غوطہ لگاتی تو پانی کے اندر دو منٹ تک رہ سکتی تھی۔ میں نے باقاعدہ گھڑی سے وقت نوٹ گیا تھا۔ جہاز کے عرشے پر ایک بڑا تیرنے کا تالاب تھا۔ اس میں لوگ سکّے پھینکتے اور وہ غوطہ لگا کر سکّے تالاب کے پیندے سے اُٹھالاتی پانی کم از کم دس فٹ گہرا ہوگا۔ وہ ایک غوطہ میں چالیس چالیس سکّے پانی کے اندر سے اُٹھالاتی تھی۔ یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے۔ دوسرے لوگ بھی شرط لگا لگا کر غوطہ لگاتے مگر اس سے زیادہ

اُٹھا پاتے۔ اس کا اسکور ہمیشہ سب سے زیادہ رہتا۔''

ہال میں سناٹا ہو گیا تھا صرف ٹروکر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''وہ پانی کی مخلوق تھی، ساتھ ہی وہ زمین کی بھی مخلوق تھی۔ اپنے پُرکشش جسم دلکش مسکراہٹ اور عمدہ لباس میں ہر وقت لوگوں سے گھیری رہتی نوجوان اس کے چاروں طرف منڈلاتے مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اور تو اور جہاز کا کپتان ہیٹلی اس کے پیچھے پیچھے اس طرح پھرتا جیسے اس کا زرخرید غلام ہو، نوجوانوں کے علاوہ شادی شدہ حضرات اپنی اپنی بیویوں سے نظر بچا کر اس کے ایک اشارے کے منتظر رہتے۔ سخت سے سخت طبیعت مرد بھی اس کے سامنے موم ہو جاتے وہ ان سے جو چاہتی کروا سکتی تھی۔ وہ اس قسم کی لڑکی تھی۔ وہ شعلہ تھی شعلہ۔ وہ بجلی کی شرارہ تھی۔ ساتھ ہی وہ نہایت مغرور بھی تھی۔ اسے اپنے عورت پن کا غرور تھا۔ مردوں کو اپنے کپڑے سے بھی حقیر سمجھتی تھی''۔

ٹروکر دم لینے کے لئے رکا اور پھر اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔

''ہر چیز اس کے قبضہ میں تھی پورا جہاز اس کے قبضہ میں تھا۔ جہاز کا ہر مسافر اس کی پرستش کرتا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ یہاں تک کہ ہم کولمبو پہنچ گئے۔ کولمبو میں ایک بھیانک واقعہ ہوا۔

کولمبو میں چھوٹے چھوٹے لڑکے جہاز کے چاروں طرف منڈلا رہے تھے۔ لوگ سکے پھینکتے وہ غوطہ لگا کر اُٹھا لاتے، پانی میں ہر وقت شارک کا ڈر تھا۔ جب لڑکے محسوس کر لیتے کہ آس پاس کہیں شارک ہے تو وہ فوراً نکل بھاگتے۔ ایک روز دوپہر کے کھانے کے بعد مس کروتھر اپنا دربار سجائے بیٹھی تھی۔ اس نے جہاز کے کپتان ہیٹلی کو سیٹی بجا کر بلایا۔ جہاز کے عرشے پر ان لڑکوں کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر مس کروتھر کے سامنے کپتان موم ہو گیا اور اس نے لڑکوں کو عرشہ پر آنے دیا۔

مس کروتھر ایک تیراک تھی اور اسے ان لڑکوں سے دلچسپی تھی۔ اس نے بہت

سے سکّے جمع کیے، وقفے وقفے سے انہیں اچھالتی وہ لڑکے عرشہ پر سے سیدھے پانی میں غوطہ لگاتے اور سکّے نکال لاتے لڑکوں کو سکّے انعام میں مل جاتے۔ لڑکوں کو پانی میں کودنے کے طریقے سے اُسے خاصی دلچسپی ہو رہی تھی۔ عرشہ پر سے اچھلنے اور گرنے کے درمیان میں جسم کو سیدھا رکھنا ایک مشکل کام تھا۔ جسم کا مرکز اوپر ہوتا ہے اوالٹنے کا ڈر ہوتا ہے جب وہ اوپر سے کودتے تو ان کا سر نیچے ہوتا۔ پانی میں پہنچنے سے ذرا پہلے وہ ہوا میں غوطہ لگا کر اپنے جسم کو سیدھا کرتے اور پانی میں پیر پہلے اور باقی جسم بعد میں پہنچتا یہ ایک خوبصورت نظارہ تھا۔

ان لڑکوں میں ایک لڑکا سب سے بہتر غوطہ خور اور تیراک تھا۔ اس کا اچھلنا پانی میں چھلانگ لگانا یہ سب غوطہ خوری دیکھنے والوں کو مسحور کر رہی تھی۔ میں نے اس سے اچھا تیراک اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ عرشے سے پانی تک کوئی ستر فٹ کا فاصلہ ہوگا۔ وہ اس خوبصورتی سے چھلانگ لگاتا کہ انسان حیران رہ جاتا وہ بار بار چھلانگ لگاتا۔ ہر شخص اس سے متاثر ہو رہا تھا۔ لیکن مس کروتھر اس سے زیادہ محظوظ ہو رہی تھی۔ وہ بڑا خوبصورت لڑکا تھا۔ چاکلیٹی رنگ، بڑی بڑی اُداس آنکھیں، زندگی سے بھرپور اٹھارہ بیس سال کا ہوگا۔

یکا یک اُس نے دوسرے لڑکوں کو خبردار کیا۔ سارے کے سارے لڑکے بھاگ کر عرشے پر آگئے اور لمبی لمبی گردنوں سے جھانک جھانک کر پانی میں دیکھنے لگے۔

''کیا بات ہوئی''۔؟ مس کروتھر نے پوچھا۔

میرا خیال ہے کہ ایک شارک اس پانی میں منڈلا رہا ہے------!

''کیا شارک سے ڈرتے ہو''؟

شارک سے ڈرنا ہی چاہیئے۔!

اتنے میں سارے لڑکے چاروں طرف سے جمع ہو گئے۔ وہ سب لڑکے مس

کروتھر کے پجاری تھے۔اس نے ان سب پر جادو سی کردی تھی۔

یکا یک وہ کپتان سے بولی۔''میرا خیال تھا کہ یہ سارے لڑکے شارک سے نہیں ڈرتے ہیں''۔یہ کہکر اس نے اس اٹھارہ سالہ لڑکے کو سکہ دکھایا اور پانی سے لانے کا حوصلہ دیا۔لڑکے نے صاف انکار کر دیا۔دوسرے لڑکے ہنسنے لگے۔لڑکا دوسرے لڑکوں کے ہنسنے پر شرمندہ ہو رہا تھا۔

بولا۔''شارک ہے''۔!

''کوئی شارک وارک نہیں ہے۔کود جاؤ پانی میں'' یہ کہکر مس کروتھر نے بہت سارے سکے لڑکے کو دیکھایا اور پانی کی طرف اشارہ کیا۔لڑکے نے گردن ہلا کر صاف انکار کر دیا۔ اُس نے سکے ایک ایک کر کے پانی میں پھینکنا شروع کیۓ لڑکا حسرت سے سکوں کو دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا مگر پانی میں جانے سے صاف انکار کرتا رہا۔

یکا یک مس کروتھر نے اپنے پرس سے ایک سونے کی اشرفی نکالی اور لڑکے کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔کپتان نے منع کیا۔

وہ اشرفی کو دھوپ میں انگلی اور انگوٹھے سے اچھالی جس کے چمک سے لڑے ی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔کپتان نے اُسے ڈانٹا۔اور کہا۔''لڑکے کو لالچ مت دو وہ کوئی خطرناک حرکت نہ کر بیٹھے''۔

اس نے اشرفی لڑکے کے سامنے پھر چمکائی لڑکے نے گردن ہلا کر انکار کر دیا۔ اس نے لڑکے کو آہستہ سے کہا۔''میرے لئے بھی نہیں۔''؟اس جملے نے لڑکے کو سحر زدہ کر دیا۔معلوم نہیں یکا یک مس کروتھر کے دل میں کیا آیا۔اُس نے سونے کی اشرفی کو اچھالا اور پانی میں پھینک دی۔قبل اس کے کہ ہم سب سنبھلتے ہم نے دیکھا کہ ادھر سکہ چمکتا ہوا پانی میں گرا چشم زدن میں وہ لڑکا اپنی جگہ سے اُچھلا اور پانی میں کود گیا۔ہم سب عرشے کی ریلنگ پر جھک کر دیکھنے لگے۔وہ دہشت ناک نظارہ سب نے دیکھا

ادھر سکّہ صاف وشفاف پانی میں گرا لڑکا تیزی سے غوطہ لگا کر اُٹھانے گیا۔ ادھر شارک چمکتے سکّے کی طرف بجلی کی طرح پلٹی اور لڑکے کا پھاڑتی ہوئی گذر گئی۔

پانی خون سے لال ہو گیا۔

عرشہ پر سناٹا چھا گیا ہر شخص پر وہشت طاری تھی۔ سب سے پہلے مس کروتھر کی کھسیانی ہنسی کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ واقعی شارک ہوگی''۔!

سب لوگ خاموش رہے۔ کپتان زور سے کھنکارا اور اس نے پانی میں تھوک دیا۔ مس کروتھر اُٹھی، اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس نے کپتان سے کہا۔ ''مجھے اندر کیبن میں لے چلو''۔ کپتان نے اُسے حقارت سے دیکھا اور خاموش رہا۔ وہ لڑکھڑائی اور اندر جانے لگی۔ یکا یک اُسے قئے ہوئی، سب نے اُس کی طرف سے منہ پھیر لیا''۔!

ٹروکر خاموش ہو گیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

''ایسی لڑکی یا عورت کو کیا کہیں گے''۔؟

کوئی کچھ نہ بولا۔ سب پر سکتہ طاری تھا۔!!

☆☆☆

بال کا رشتہ

آج وہ خود ایک دلہن بن کر سسرال آئی تھی، آج اسے اپنی نفاست اور عقلمندی کا ثبوت دینا تھا۔ اسے یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ اس گھر کو غیر نہیں بلکہ اپنا گھر سمجھ کر صاف ستھرا رکھ سکتی ہے۔ اُسے اپنی محنت اور محبت سے ظاہر کرنا تھا کہ وہ اس گھر کی ہی ایک فرد ہے۔ اُسے یہ سمجھانا تھا کہ وہ اپنی ساس کو اپنی ماں مانتی ہے اور اپنے آپ کو ان کی بیٹی سمجھتی ہے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنا جمپر اور شلوار اُتار کر ان کے بدلے پرانے کپڑے پہنے، سر پر رومال باندھا اور ہاتھ میں جھاڑو لے لیا۔ اوپر کی منزل سے نیچے تک اس نے جھاڑو لگائی۔ سب کمروں کی چٹائیاں جھاڑیں۔ کونوں سے مکڑے کے جالے اتارے۔ آنگن میں جو کئی دنوں سے کوڑا کرکٹ پڑا تھا اُسے جمع کر کے ایک کونے میں رکھ دیا۔

محلے بھر کی عورتوں نے جب رشیدہ کو صفائی کرتے دیکھا تو وہ حیران رہ گئیں کہ کیسے اس نے سسرال آتے ہی پہلے دن سے ہی صفائی شروع کی اور چیزوں کو قرینے سے سجا کر رکھنے لگی ہے۔ رسوائی گھر میں جتنے بھی برتن تھے انہیں گھر کے ٹیوب ویل پر لے جا کر خوب مل مل کر چمکایا، اور پھر ان سب کو قرینے سے شلف پر رکھ دیا۔ انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ سب ابھی بازار سے خرید کر لائے گئے ہیں۔ اُس دن ساگ پکنے کو آیا تھا۔ اس نے صاف ستھرا کر کے انہیں آگ پر ابلنے کے لئے رکھ دیا۔ اپنے گھر پر بے خوف ہو کر کھانا پکاتی تھی۔ اگر کبھی بھول سے چاول گیلا ہو جاتا یا پھر ترکاری میں زیادہ

نمک پڑ جاتا اور ماں اُسے ڈانٹتیں تو چند ہی لمحوں بعد وہ ان باتوں کو بھول سی جاتی تھی۔لیکن ابھی ابھی جب وہ ترکاری کی ہانڈی آگ پر رکھ رہی تھی تو ایک انجانا سا خوف جاگ اُٹھا۔اس نے سوچا اگر آج کا کھانا مزیدار نہیں ہوا تو اسے طعنے سننے پڑیں گے۔اس لئے آج کھانا بنانے میں پوری توجہ کرنی چاہئے تا کہ لذیذ کھانا بنے اور گھر کے لوگ اُسے کھا کر خوش ہو جائیں۔اسی لئے اس نے ہر کام میں احتیاط برتی، چاول میں انداز سے پانی ڈالا اور پھر سبزی میں اپنی ساس سے پوچھ کر نمک اور مرچ ڈالا۔یہ کام کرتے ہوئے چار بار خدا سے دعا بھی مانگتی رہی کہ ''اے خدا میری عزت رکھنا--؟''

اس نے سوچا اگر وہ گھر کے اخراجات میں کچھ بچت کر سکے گی تو ممکن ہے کہ اس سے بھی اس کی عزت بڑھ جائے۔اس لئے اس نے لکڑی اور گوئیٹھے کم سے کم جلانے کی کوشش کی جس قدر مسالے ڈالنے کی عادت اسے میکے میں تھی اس میں بھی اس نے تھوڑی کمی کی۔آگ بجھانے سے پہلے اس نے اچھی طرح سے دیکھا کہ چاول اچھی طرح پکا کہ نہیں، سبزی میں نمک کم تو نہیں مرچ کہیں زیادہ تو نہیں؟ ہر طرح مطمئن ہونے کے بعد وہ ہاتھ منہ دھو کر شام سے پہلے ہی اس کے گھر والوں کے کمروں میں بستر لگا دیئے۔ایک منٹ بھی وہ آرام سے نہیں بیٹھی۔ مسلسل سوچتی رہی کہ کہیں کوئی کام ادھورا تو نہیں رہا، کسی کام کو تو بھول نہیں گئی؟

شام کو جب کھانا کھانے کا وقت ہوا تو اس کی ساس رسوئی گھر میں تختے پر بیٹھ گئی، کھانا لگانے سے پہلے اس نے اپنے سر پر پھر رومال باندھا۔رومال باندھتے وقت اس کے رومال سے ایک لمبا بال سبزی کی ہانڈی میں گر گیا۔سب گھر والے بیٹھے تھے۔کسی نے بھی سبزی میں بال گرتے نہیں دیکھا تھا۔ساس نے جب کھانا لگانا شروع کیا تو رشیدہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔شکر ہے کہ کھانا لگاتے وقت اس کی ساس کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں پڑی۔جس سے رشیدہ نے اندازہ لگایا کہ چاول ٹھیک

بنا ہے۔ سبزی میں جیسے ہی بڑا چمچہ ڈالا گیا۔ سبزی کی خوشبو سارے کمرے میں پھیل گئی۔

سب لوگ اس خوشبو سے خوش ہوئے۔ ساس بھی اس سبزی کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ رشیدہ نے خود بھی یہ محسوس کیا کہ سبزی بھی اچھی بنی ہے۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ قدرت اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دے گی۔ کھانا کھاتے وقت ساس کے پیالے سے ایک لمبا بال نکلا اُس او نے اسے ہاتھ میں اُٹھایا اور سب گھر والے اسے دیکھنے لگے، ساس نے اپنے لڑکے کی طرف ایک تیکھی نظر ڈالی۔ چھوٹی نند نے بھی اپنے بھائی کی طرف ناراضگی سے دیکھا اور کھانا چھوڑ دیا۔ دیور دیکھنے لگا کہ یہ کیا ہوا؟ رشیدہ کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور سر چکرانے لگا۔ ساس نے چپ سادھ لی لیکن اس خاموشی میں بھی ایک آتش فشاں چھپا ہوا تھا۔ رشیدہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ ابھی ایک آتش فشاں پھوٹ پڑے گا۔ جس میں اس کے ارمان، امیدیں اور سنہرے خواب چُور چُور ہو جائیں گے۔ اور یہی ہوا۔ ساس نے سب کی طرف دیکھ کر کہا۔ یہ اس نے آج پہلی بار اپنی شوبھا بڑھائی ہے اور اب نہ جانے آگے کیا کیا الٹ پلٹ دکھائے گی، جو کچھ آج تک ہم نے نہیں دیکھا تھا وہ آج دیکھنا پڑا ہے۔ رشیدہ نے دل میں سوچا۔ کاش! یہاں کوئی کنواں ہوتا تو وہ اس میں کود کر جان دے دیتی۔ یہ باتیں اس کے دل کو چھلنی کیے جا رہی تھیں۔ وہ کیا سوچ رہی تھی اور کیا ہو گیا۔

ساس نے اپنے لڑکے سے کہا۔ ”تم اسی وقت اس کے میکے اسے واپس بھیج دو، اگر آج اس کے میکے والوں کو اس کی یہ شوبھا دکھائی نہیں گئی تو ہمیں عمر بھر پچھتانا پڑے گا۔“ رشیدہ کو ایسا لگا کہ اس کے منہ پر کالک مل دی گئی ہو۔ اسے خیال آیا کہ محلے کی ساری عورتیں اور لڑکیاں ہنس رہی ہیں۔ اور طعنہ دے رہی ہیں۔ یہ سوچتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ساس نے کہا ”رونے دھونے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر تم کو عقل ہوتی تو اس طرح رونا ہی کیوں پڑتا۔ ہم نے محلے میں دوسری

دلہن بھی دیکھی ہیں، جو پکانے میں ماہر ہیں۔" رشیدہ کا چھوٹا دیور اپنی ماں سے کہنے لگا۔ "ماں تم کس بات کو لے کر بیٹھ گئی۔ غلطی تو انسان سے ہو ہی جاتی ہے۔ کیا اس بے چاری نے جان بوجھ کر سبزی میں بال ڈال دیا ہے۔" "تم چپ رہو۔ تمہارے خیال میں یہ معمولی بات ہے۔" ماں نے اپنے بیٹے کو ڈانٹ دیا۔

ساس نے پھر کہا۔ "ہائے ہائے، میں نے آج تک نہیں دیکھا کہ سبزی میں بال نکلے، توبہ توبہ..... ساس ابھی یہ بات کہہ رہی تھی کہ باہر کا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ دروازہ کھولا گیا تو باہر سے ساس کی بڑی بیٹی دوڑتی ہوئی آئی اور ماں کے ساتھ لپٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

"کیوں بیٹی خیریت تو ہے؟" ماں نے پوچھا۔

"ماں آج پانچ سال بعد مجھے جواب دے دیا گیا۔ پالک کے ساگ میں محض ایک بال نکل جانے کے باعث ساس نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔" وہ روتی ہوئی بولی۔

یہ سن کر سب خاموش رہے۔ سب اپنی اپنی جگہ پر بالکل بت بنے رہے۔

☆☆☆☆☆

بچت

انور آٹو رکشا کو خوب دھو پونچھ کر دو قدم ہٹا اور جائزہ لینے لگا کہ کہیں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔ کمی تو ہر بار رہ جاتی تھی۔ اس مرتبہ اسے شیشے پر معمولی سا دھبہ دکھائی دیا اور اُس نے آگے بڑھ کر وہ دھبہ صاف کر دیا۔

یوں تو انور کی آٹو رکشا کافی پرانی ہو چکی تھی مگر چمک دمک سے ایسا لگتا تھا جیسے ابھی نئی خریدی گئی ہو۔ انور خود بھی صاف ستھرا رہتا، اور اپنے بیوی بچوں کو بھی صاف ستھرا رکھتا تھا اور اس کی آٹو رکشا تو دلہن کی طرح نکھری، سجی رہتی تھی۔

ابھی پو پھٹی نہ تھی۔ صبح کی ٹرینوں کا وقت ہو چلا تھا۔ گلی میں ہلکا اندھیرا تھا انور لپک کر سیڑھیاں چڑھا اور دروازے پر کھڑی اپنی بیوی کے گال کو چوما اور پلٹ کر آٹو رکشا میں بیٹھ گیا۔

یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ روز کا معمول کچھ اور بھی تھا وہ عام ٹیکسی یا رکشا ڈرائیوروں کی طرح نہ تھا۔ اس نے کچھ ضابطے بنا رکھے تھے۔ جن پر عمل کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ مثلاً اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ کبھی فالتو باتیں نہ کرے گا۔ جوا نہیں کھیلے گا، شراب نہیں پیئے گا، کوٹھوں پر نہیں جائے گا اور سواریوں سے کسی طرح کی بے ایمانی نہ کرے گا۔ اسکے جان پہچان والے اسے ''مُلّا'' کہتے تھے۔ جب شہر میں کسی ٹیکسی یا آٹو رکشا ڈرائیور کی ایمانداری کی کوئی انوکھی بات سننے میں آتی تو اس کی برادری ایک

زبان ہوکر کہہ اُٹھتے۔''سالا مُلاّ ہوگا۔''

بعد میں اس کی خبر لی جاتی۔''مُلاّ! تم نے پچیس ۲۵۰۰۰/ ہزار کی تھیلی واپس کردی اور اس میں سے کچھ نہ رکھا''؟

''میں کیا رکھتا! میرے پاس ایمان رکھا ہوا تھا۔ خیر چھوڑو تم نہیں سمجھو گے۔'' مُلاّ انوؔر سنجیدگی سے جواب دیتا۔

'' کہنے والا کٹ کر رہ جاتا۔ سب جانتے تھے کہ مُلاّ سے بحث کرنا فضول ہے۔

انوؔر کے ایک اصول پر تو سب حیران تھے۔ شروع شروع میں تو اس کا خوب مذاق اڑایا جاتا تھا۔ انوؔر یا تو سنی ان سنی کر دیتا یا مسکرا کر رہ جاتا۔ اس کا اصول تھا کہ شام ہوتے ہی آٹو رکشا کا رُخ گھر کی طرف کرلیتا۔ چاہے کتنی ہی آمدنی کی سواری اس کی راہ میں حائل ہو۔

''خالی نہیں ہے۔'' خالی نہیں ہے''۔ بس ایک ہی جواب۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ شام کے بعد اس کی آٹو رکشا چلتی ہی نہ تھی۔ چلتی تھی مگر اس وقت اس میں سوار ہوتے تھے۔ اس کے دو پیارے بچے اور اسکی خوبصورت، سجی سنوری بیوی زلیخا۔ شام اسکی اپنی فیملی کے لئے مخصوص تھی۔

مغرب کی نماز کے بعد اس کی رکشا شہر کی مختلف سیر گاہوں کی جانب دوڑتی پھرتی تھی۔ یہی وقت ہوتا تھا جب وہ سب سے زیادہ خوش دکھائی دیتا تھا۔ بیوی اور بچوں کے دمکتے چہروں کو دیکھ کر اسے عجیب سا سکھ اور سکون محسوس ہوتا تھا۔ رات کی پہلی گھڑی میں وہ خود کو کسی شہنشاہ سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ جو لوگ کاروں میں اسکوٹروں پر اپنی فیملی کو تفریح کے لئے لے جاتے ہیں، ان سے وہ کسی طرح کم نہیں ہے۔

وہ صبر وشکر کا پتلا تھا۔ شام تک جتنا کماتا سب لاکر زلیخا کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔

بیوی زلیخا کو میاں کی ہر بات، ہر ادا پسند تھی۔ اس کی سب سے چہیتی بہن رخسانہ بڑے بڑے دن دیکھ رہی تھی۔ اس کا خاوند کماتا خوب تھا۔ لیکن رخسانہ کو ٹھینگے پر رکھتا تھا۔ جانے کیسی کیسی بُری لتیں پال رکھی تھی۔ رخسانہ ہی کیوں، اس کے آس پاس کے بیسیوں اللہ کی بندیاں تھی جو میاں کے میٹھے بول کے لئے ترستی تھیں۔ میاں کے ساتھ سیر سپاٹے تو گویا ان کے لئے خواب وخیال کی باتیں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایسی عورتیں زلیخا کی قسمت پر رشک کیا کرتیں اور زلیخا آسودہ مرغی کی طرح گردن اکڑا اکراتاتی پھرتی۔

انور خاموش طبع شخص تھا۔ اس کی رکشا ریلوے اسٹیشن کے علاقے میں سدا بہار ہوٹل کے باہر کھڑی رہتی تھی۔

اس کے زیادہ سواریاں پردیسی ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس نے پردیسی کو بھی ٹھگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ غیر ملکی مسافروں کے ساتھ تو وہ مہمانوں کے جیسا سلوک کرتا تھا۔

اس کے شہر میں میٹر کا چلن نہیں تھا۔ یعنی میٹر تو تھا مگر چلایا نہیں جاتا تھا۔ اس لئے سارا معاملہ سودے بازی پر ٹکا ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ جب بھی کرایہ مانگتا۔ واجب ہی مانگتا۔ غیر ملکی مسافر تو حیرت سے اس کا منہ تکنے لگتے۔

"آئی......اٹ، از...... سفی شینت سر۔"! وہ سلام کے لئے ہاتھ اُٹھا کر غیر ملکی مسافر سے کہتا۔!

"تھینک یو، تھینک یو"۔ غیر ملکی مسافر حیران ہو کر اس کا شکریہ ادا کرتا۔

"مُلّا یار! کیوں ہمارے پیٹ پر لات مار رہا ہے۔"؟ پچاس کی سواری تھی۔ تیس میں ہی نمٹادی۔ گھما کر لے جاتا۔ کیا پتہ چلتا اسے"!

جب ان لوگوں کو یہ پتا چلا کہ مُلاّ انور رات کو اُٹھ کر رکشا اس لئے نہیں چلاتا کہ وہ اپنی بیگم کو اِدھر اُدھر گھمانے لے جاتا ہے تو ایک نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''بیگم سے کرایا بھی وصول کرتا ہے کہ نہیں۔''؟

''گھر جا کے وصول کرتا ہوگا مُلاّ۔ آدمی کا بچہ ہے اوپر اوپر سے مُلاّ اور اندر سے......''! کسی دوسرے نے کہا۔

اور اس پر سب ہو ہو کر کے ہنسنے لگے۔ یہ مذاق خود انور کے سامنے ہوا تھا جب وہ اپنے آٹو رکشا میں خاموش بیٹھا سواری کا انتظار کر رہا تھا۔ مذاق میں کہی ہوئی بات کیل کی طرح اس کے دل میں کھب گئی۔ پھر ایک روز انور کے دماغ میں ایک خیال کوندا۔ کتنا پیٹرول پھونک چکا ہے اپنی زلیخا کے لئے؟ اُس حساب سے دھت تیرے کی! میں کہاں! الجھ رہا ہوں؟ نہیں، نہیں میں تو بس یوں ہی سوچ رہا تھا۔ کیوں نہ اسی بات پر پیاری زلیخا کو ''سرپرائز'' دیا جائے۔ اس سے محبت اور دونی ہو جائے گی۔

اگلے دن جب انور نے اپنی زلیخا کی حنائی ہتھیلی پر دن بھر کی کمائی رکھی تو اس میں کچھ نوٹ کم تھے۔ لیکن زلیخا کو اس کا خیال ہی نہ ہوا۔ وہ بھی اپنے میاں کی دیوانی تھی۔ میاں کے سامنے آتے ہی اسے دین و دنیا اور بچوں کا ہوش نہ رہتا۔ زلیخا نے انور سے کمائی کم دینے پر کبھی کچھ نہ پوچھا۔ وہ سوچتی کہ آئے دن ہڑتالوں اور ہنگاموں سے کمائی پر اثر پڑا ہے۔ کوئی تنخواہ تو ہے نہیں کہ مقررہ رقم ہاتھ میں آئے پھر بھی اللہ کا کرم ہے۔

تفریح اب بھی رہتی تھی۔ لطف اور مزے اب بھی ہوتے تھے مگر کچھ تبدیلی ضرور ہوئی تھی۔ ایسی تبدیلی جو انور اور زلیخا اپنی اپنی جگہ شدت سے محسوس کر رہے تھے۔

ایک دن جب ایک ساتھ پانچ سو روپے انور نے اپنی پیاری بیوی زلیخا کو

دیئے تو اس کی آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں۔

''نہیں بیگم نہ جوا کھیلا، نہ کہیں ڈاکا ڈالا، یہ اپنا ہی روپیہ ہے، میں روز حساب رکھتا رہا شام کے گھومنے کا تین ہفتوں میں اتنا روپے کا پٹرول خرچا ہوا ہے۔ اب تو ان روپیوں سے دو بہتر سوٹ سلوا لے تا کہ تو اور بھی خوبصورت نظر آئے۔ خدا قسم! تیرا رنگ اور بھی کھلتا جا رہا ہے۔ نواب خاندان کی بیگم کی طرح نظر آتی ہے آج کل''۔

یہ پہلا موقع تھا جب زلیخا اپنی تعریف سے خوش نہ ہوئی۔ بے دلی سے روپیہ ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔ تفریح میں روزانہ اتنے روپئے کا پیٹرول خرچ ہوتا ہے اور لوگوں کی نگاہوں میں بھی آتے ہیں۔ بس بہت ہو چکا کبھی کبھار تفریح کیلئے جایا کریں گے۔''

''سرپرائز'' دینے کا سارا جوش زلیخا کے بجھے ہوئے اور شکایت آمیز جملوں سے انور اداس ہو گیا۔

اس دن کے بعد زلیخا شام کو تفریح کے لئے جانے سے انکار کرنے لگی۔ ہاں بچوں کا دل بہلانے کے لئے کبھی کبھی بے دلی سے آٹو رکشا میں بیٹھ جاتی۔ اور جب پیٹرول مزید مہنگا ہو گیا اور چاروں طرف ہائے توبہ مچنے لگی تو زلیخا نے فیصلہ صادر کر دیا کہ شام کی تفریح اب ہمیشہ کے لئے بند، ضرورت پڑنے پر باہر نکلا کریں گے۔''

انور کے لئے یہ فیصلہ کسی سزا سے کم نہ تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو منانے کی بہت کوشش کی مگر عورت کی ضد کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔

دن گزرتے رہے۔ زلیخا کی ساری نفاست کافور ہو گئی۔ اسکے چہرے سے آسودگی کی جگہ وحشت سی برسنے لگی، انور نے محسوس کیا کہ عورت کتنی ہی محبت کرنے والی کیوں نہ ہو، اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ آخر وہ سمجھتی کیوں نہیں کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ وہ

سمجھا سمجھا کر تھک گیا مگر زلیخا پر بچت کرنے کی دُھن اسی طرح سوار رہی اور اس دُھن میں اس کے چہرے کی ساری شادابی رخصت ہوگئی۔

ایک دن رات کو انور نشے میں چور گھر واپس آیا......مُلّا انور جو سب عیبوں سے پاک تھا، جو نمازی تھا دیانت دار اور اصول پسند تھا جو اپنی زلیخا کا حقیقی معنوں میں ''یوسف'' تھا اسے اس حال میں دیکھ کر زلیخا بُت بنی سوچنے لگی کہ۔ ''مجھ سے کہاں غلطی ہوئی''۔؟ !!!

☆

نثار احمد صدیقی سے فلم و ادب پر ایک مکالمہ

نثار احمد صدیقی ہند و پاک کے اردو ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔ وہ ایک ہونہار کہنہ مشق افسانہ نگار کے علاوہ ذہین مضمون نگار بھی ہیں ۔ صوبہ بہار ضلع گیا سے نکلنے والے ہفتہ روزہ ''مورچہ'' ماہنامہ ''آہنگ'' کے معاون مدیر، پندرہ روزہ ''صبح مگدھ'' (اورنگ آباد۔ بہار) کے چیف ایڈیٹر رہے ہیں۔ نثار احمد صدیقی و کلام حیدری مرحوم کے مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ ''مورچہ'' ''آہنگ اور ''صبح مگدھ'' سرحد پار بھی کافی مقبول ہوئے اور کئی انعامات بھی حاصل کئے، اس کے علاوہ انہوں نے چار فلموں کی کہانی ''کریما، رکت دان، بھوت راج، اور پرانی حویلی'' بھی تحریر کی ہے۔ جو فلم ساز سرور صبا، جواہر لعل بافنا، مکیش وگل (آنجہانی) اور ساجد نے مکمل کر کے کئی سال قبل ریلیز کر چکے ہیں۔ دو ٹی وی سیریل ''ایک ہی منزل'' اور ''تمکنت'' کی کہانی فلم ساز اکبر خان اور ونیتا بھگت کے لئے بھی لکھ چکے ہیں اس کے علاوہ مسلسل ادبی رسالوں و اخبارات میں لکھتے رہے ہیں اور ساتھ ہی کسی نہ کسی ادبی، فلمی رسالے و اخبار کے معاون مدیر یا اعزازی نمائندہ بن کر اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اپنا نام رسالے میں چھپوانا نہیں چاہتے اسی لئے اردو ادب والوں کو علم نہیں ہو پاتا کہ وہ کس رسالے سے منسلک ہیں۔

نثار احمد صدیقی کافی مصروف انسان ہیں، ان مصروفیتوں کے بنا پر چند سال قبل چائے اور سگریٹ زیادہ استعمال کرنے لگے تھے اور اس کی زیادتی نے تین سال تک

موذی مرض میں بتلا رکھا تھا۔ علاج معالجے سے اب وہ بالکل تندرست ہیں۔ اور سگریٹ وچائے سے توبہ کر چکے ہیں۔ رومان پسند اور کم گو انسان ہیں۔ کبھی کبھی موڈ ہونے پر سختی کے ساتھ صوم وصلوٰۃ کے پابند بھی ہو جاتے ہیں۔

اب تک ان کی چار کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور تین کتابیں زیر طبع ہیں۔ جو سال کے آخر تک منظر عام پر آ جائیں گی۔ ان کی تصانیف میں ایک ایسی معرکتہ الاراء تصنیف (''عکس''۔ ادبی انٹرویو کا مجموعہ) بھی ہے جو لکھنؤ یونیورسٹی کے نصاب ایم اے (اردو) میں کئی سالوں تک شامل رہے۔ ان تمام چیزوں سے بڑھ کر وہ نہایت صاف و ستھرے ایماندار اور مخلص انسان ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ خوددار اور ضدی بھی ہیں۔ ضد اور خودداری پر اپنی جان بھی قربان کر دینے میں نہیں ہچکچاتے۔ (یہ بات ان کے برادر خورد تسلیم انجم سے دہلی میں معلوم ہوئی تھی) لاابالی کی انتہا ہے۔ بال بچوں کو کبھی کبھی بھول سا جاتے ہیں۔ بہرحال ذیل میں ان سے لیا گیا ذاتی وادبی انٹرویو پڑھ کر آپ خود ہی اندازہ کر لیں کہ نثار صدیقی کی اردو ادب میں کیا مقام ہے۔

سوال: آپ کا اصلی نام؟

جواب: مجھے نثار احمد صدیقی کہتے ہیں۔

سوال: جائے پیدائش؟

جواب: ڈہری اون سون، ضلع روہتاس (بہار)۔

سوال: آپ کی تخلیقات اب تک کن کن رسائل میں شائع ہو چکی ہیں؟ اور فی الحال کون سے رسائل میں لکھ رہے ہیں؟

جواب: پاکستان کے رسالے ''اوراق، سیپ، فنون، ادب لطیف، جام نو، سوداگر'' اور دوسرے بنگلہ دیش کے رسالے ''محاذ'' آئینہ' نورونار''۔ کناڈا کا رسالہ ''اردو انٹرنیشنل'' اور ہندوستانی رسالے'' شاعر، شاخسار'' سب رنگ، صبح اب،

غبار خاطر، سوغات، نیا سفر، ادبی سفر، نشانات، جواز، آہنگ، مورچہ، سہیل، زبان و ادب صبح نو، آج کل، صنم، نیا دور، فروغ ادب، روح ادب، جمنانٹ، فروغ اردو، بیسویں صدی، شمع، گلفام، فلمی سارے، عارض، فوٹو فیئر، باجی، ایوان ادب، بے باک مباحثہ اور ''گلابی کرن'' وغیرہ میں میری تخلیقات شائع ہو چکی ہیں۔ فرصت کے اوقات کم میسر ہیں۔ اس لئے ہندوپاک کے گنے چنے رسائل ہی میں لکھ رہا ہوں۔

سوال: آپ کو بحیثیت انٹرویو نقاد بہت زیادہ شہرت ملی، مگر بہ حیثیت افسانہ نگار آپ کو خاطر خواہ شہرت نہیں ملی کوئی خاص وجہ؟

جواب: اب تک ساٹھ ستر افسانے لکھے، جن میں بہت سارے افسانے ابتدائی دور کے تھے، جسے تلف کر دیا۔ چند افسانے ترجمہ ہو کر ہندوستان کی بہت سی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اگر میں صرف افسانہ لکھنا شروع کروں تو یقیناً توقعات کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔ ویسے ہندوپاک کے چند نقادوں (جدید قدیم) نے میرے افسانے پر مضامین لکھے ہیں۔ جس سے میں مطمئن ہوں۔

سوال: آپ نے علامتی اور استعاراتی افسانہ لکھا ہے۔ اس سفر میں آپ کو سب سے زیادہ متاثر کس نے کیا ہے؟

جواب: میرے چند افسانے علامتی اور استعاراتی نوعیت کے ہیں۔ لیکن کوئی الگ سے طئے شدہ سامان نہیں ہے۔ مجھے قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، بلراج من را، سریندر پرکاش، احمد ہمیش، رشید امجد، احمد داؤد، علی حیدر ملک، ظفر اوگانوی کلام حیدری، جوگندر پال، ایوب جوہر، انور خاں، شوکت حیات اور انور شیخ نے خاص طور سے متاثر کیا تھا۔

سوال: تخلیقی افسانہ کیا چیز ہے؟ کیا منٹو کے افسانے تخلیقی افسانے نہیں ہیں؟

جواب: تخلیقی افسانہ اسے کہہ سکتے ہیں جو دل سے نکل کر دلوں تک پہنچے اور زندگی کو ہر نئے زاویے سے دیکھنے اور سمجھنے میں تعاون دے۔ منٹو واحد افسانہ نگار ہے۔ جس کے پاس تخلیقی افسانہ موجود ہے۔

سوال: کیا مغرب کی اندھی تقلید میں یہاں کے نئے افسانہ نگاروں میں چند نقال پیدا ہو گئے ہیں؟

جواب: اس میں مغرب کی تقلید کا کوئی دخل نہیں۔ جس زبان میں جو اسلوب مقبول یا چونکانے والا ہوتا ہے اسے اختیار کر لینے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

سوال: نئے افسانے کا ناقد کون ہے؟

جواب: نئے افسانے کے بہترین ناقدوں میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر انور سدید شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر وہاب اشرفی، مہدی جعفر، نظام صدیقی، پروفیسر لطف الرحمٰن اور طارق سعید ہیں۔ ویسے اور دوسرے بھی ہیں لیکن اہم ناقدوں میں شمار نہیں کیے جا سکتے۔

سوال: اردو کا مستقبل؟

جواب: میں پیشن گوئی کا قائل نہیں۔ بلکہ اردو نے ان ساٹھ برسوں میں اپنی زندگی کا جو ثبوت دیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ آج بھی عوامی سطح پر اردو کے گانے اور غزلیں سب سے زیادہ مقبول ہیں۔

سوال: آپ فلم انڈسٹری میں کب آئے تھے؟ اور سب سے پہلے کس فلم کی کہانی تحریر کی تھی؟

جواب: ۲۲ برس قبل ''مورچہ'' ''ماہنامہ'' ''آہنگ'' ''صبح مگدھ'' اور دیگر اخبار و رسائل میں بطور صحافی ملازمت کرنے کے بعد ستمبر ۱۹۹۵ میں فلم ساز سرور صبا صاحب کے اسرار پر ممبئی آیا۔ دراصل سرور صاحب میری ایک کہانی ''کریما'' پر فلم بنا رہے تھے اور یہی سب سے پہلی فلم کی کہانی ہے۔

سوال: آپ اب تک کتنی فلموں کے لئے کہانی تحریر کر چکے ہیں؟

جواب: اب تک چار فلموں کے لئے کہانیاں لکھ چکا ہوں، لیکن اب میں فلموں سے کنارہ کشی اختیار کر چکا ہوں۔

سوال: کیا آپ نے ٹی وی سیریل کی کہانی بھی تصنیف کی ہے؟

سوال: جی ہاں۔ ''ایک ہی منزل'' اور ''تمکنت'' اکبر خاں اور ونیتا بھگت کے لئے لکھ چکا ہوں۔

سوال: فلمی دنیا میں آپ کے پسندیدہ کہانی کار؟

جواب: جاوید اختر، ویدراہی، علی رضا، اقبال درانی، انیس بزمی، اور مراق مرزا۔

سوال: فلم کے ذریعے ادب کی خدمت کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب: بہت حد تک کی جاسکتی ہے، جیسے ساحر، مجروح، سردار، ندا فاضلی اور اختر الایمان نے کی ہے۔

سوال: آج کل جس طرح کی فلمی کہانیاں لکھی جارہی ہیں۔ اس کے معیار سے آپ کہاں تک متفق ہیں؟

جواب: آج کی فلمی کہانی میں معیار کہاں؟ پہلے اچھی کہانیوں پر فلمیں بنتی تھیں۔ اور اس زمانے کے فلم ساز اردو ہندی کہانیوں کا پرکھ رکھتے تھے۔ آج کے فلم ساز ہالی ووڈ کی نقل کر رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے بہت ساری فلمیں فلاپ ہو رہی ہیں۔ ہم ہندوستانی ہیں ہندوستانی کلچر و تہذیب پر فلمیں بننا شروع ہو جائے تو یقیناً چند فلموں کو چھوڑ کر سب فلمیں کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔

سوال: آج کل کی فلمیں غیر معیاری کہانی پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود بھی یہ فلمیں عوام میں زیادہ مقبول ہیں۔ ایسا کیوں؟

جواب: جی نہیں، یہ بالکل جھوٹ ہے۔ فلمسازوں سے جا کر پوچھئے۔ آپ کو معلوم ہو

جائے گا۔

سوال: فلمی دنیا میں فلمی کہانی کار کی حیثیت کیا ہے؟ کیا فلمساز کے اشارے پر ہی کہانیاں تحریر کرنی پڑتی ہے۔

جواب: فلمی دنیا میں فلمی کہانی کار کی حیثیت ایک روح کی ہے جب روح ہی نہیں ہوگی تو فلم کیسے بنے گی۔ ہاں، یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی فلم سازوں کے اشارے پر ہی کہانیاں تحریر کرنی پڑتی ہے۔

سوال: آج سے ۲۵۔۳۰ سال قبل تک فلمی کہانی کار جو کہانی تحریر کرتا تھا۔ اس میں ''کہانی پن'' موجود رہتے تھے۔ لیکن آج اسی کی ضد ہے، ایسا کیوں؟

جواب: اس زمانے میں اوریجنل کہانی کار ہوتے تھے۔ ان سبھوں کے یہاں خداداد صلاحیت ہوتی تھی۔ اسی لئے ان کی فلمی وادبی کہانیوں میں کہانی پن موجود ہوتے تھے۔ آج بھی اس فلم انڈسٹری میں چند اچھے کہانی کار موجود ہیں۔ جن کی کہانیوں پر فلم بنائی جائیں تو یقیناً فلم کامیاب ہوں گے۔ شرط یہ ہے کہ ہمارے فلم ساز مغرب کی تقلید نہ کر کے فلم سازی کریں۔

سوال: آپ نے فلمی دنیا میں بہت کم وقت میں مقبولیت حاصل کر لی تھی، اس کی وجہ؟

جواب: میں ایک صحافی کے ساتھ ساتھ ہندو پاک کا ایک اہم کہانی کار وانٹرویو بھی تھا، میری تخلیقات ہندو پاک کے سبھی معیاری رسائل میں شائع ہوتی رہی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلمی دنیا سے وابستہ سبھی شعراء و کہانی کار قبل ہی سے مجھے جانتے تھے۔ فلم انڈسٹری میں جب میں آیا تھا تو مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

سوال: آج کے نوجوان اردو ادیبوں اور شاعروں کے لئے اپنے فلمی وادبی تجربات کی روشنی میں کچھ مفید مشورے دیں؟

جواب: اردو کے نوجوان کہانی کار فلمی دنیا میں ضرور جائیں لیکن فلمی کہانی، مکالمہ اور اسکرین پلے لکھنے کا تجربہ پہلے ضرور حاصل کر لیں۔

سوال: فلمی دنیا میں اردو کا مستقبل؟

جواب: ٹھیک ٹھاک ہے۔ اردو جانے بغیر فلمی دنیا میں کوئی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ فلمی دنیا والے زیادہ تر اردو سیکھنے کے لئے اردو ٹیچر رکھتے ہیں۔ جو اردو نہیں سیکھے ہوتے ہیں وہ دو تین فلموں کے بعد تماش بین ہیرو ہیروئنوں کو دھتکار دیتے ہیں۔ آج مغرب سے تعلیم حاصل کر کے فلم میں ہیرو ہیروئن بن رہے ہیں ظاہر ہے کہ ان سب پر انگریزی حاوی ہے، جس سے ہماری فلم انڈسٹری متاثر ہورہی ہے، جو مستقبل کے لئے خطرناک ہے۔

ایس. خان (فلم رائٹر و مکالمہ نگار)
ممبئی

☆☆☆

حرفِ آخر

شان الرحمن

نثار احمد صدیقی اردو کے فن کاروں میں شمار کئے جائیں گے جو اپنی اضطرابی کیفیت کی بنا پر کسی مقام پر رک نہیں سکے لیکن ان کا تخلیقی سفر ہمیشہ جاری رہا۔ کلام حیدری کے مشہور رسالے ''آہنگ'' اور ہفتہ وار ''مورچہ'' سے بھی وہ منسلک رہے اس طرح ادب کے علاوہ عالمی منظرنامے پر جو اتھل پتھل ہوتی رہی نثار احمد صدیقی اس سے بھی واقف رہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقی کاوشیں جب سامنے آئیں تو نہ صرف سماجی استحصال زندگی میں بدلتی ہوئی ترجیحات سے ہم روشناس ہوئے بلکہ قارئین کو یہ بھی پتہ چلا کہ ان کے فن میں سماجی احتجاج کا تیور نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے یہ صحیح ہے کہ بیچ میں ان کا ادبی

سفر کچھ رکا رہا لیکن یہ رکاوٹ اس ارتقا کی مثال بن گئی جو نثار احمد صدیقی کے فن میں نمایاں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے فن پر ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر قیام نیر، ڈاکٹر اسلام عشرت اور پروفیسر طارق سعید کے علاوہ کئی ادبی شخصیات نے خیالات کا اظہار کیا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ خیالات مثبت رخ کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں کلائمکس، انٹی کلائمکس، کینوس پر ایک زندہ تصویر، بارود زدہ چہرا، اپنی ٹاف، اجنبی شہر میں ایک انسان، اور اسے کیا کہیں گے۔ یہ وہ کہانیاں ہیں جو نثار احمد صدیقی کے زندگی سے جڑی داستان سناتی ہیں۔ ان میں زندگی کی الگ الگ تصویر ہی نہیں بلکہ فنکار کی وہ کراہ بھی شامل ہے جو سماج کی تصویر کو بدصورت دیکھنا نہیں چاہتی۔ سماجی زندگی خوبصورت ہو، قدرت کے نظام کے مطابق ہو اور خوشی کی لہریں موجزن ہوں یہی صحیح تخلیق کار کا خواب ہے۔

نثار احمد صدیقی کی یہ کہانیاں ہمیں زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کا احساس بھی دلاتی ہیں اس کی شکست وریخت سے روشناس بھی کراتی ہیں اور ہماری ترجیحات میں جو تبدیلی آرہی ہے اس کا بھی اظہار کرتی ہیں۔ ہمیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مشرق جو روحانیت کا علمبردار رہا ہے اس پر مادیت کس طرح حاوی ہونے کی کوشش کر رہی ہے لیکن بہتر زندگی کا تصور فن کار دیکھ رہا ہے اس لئے کسی بھی اچھے فن کا تقاضہ یہی ہے کہ لڑکھڑاتے ہوئے انسانوں، لڑکھڑاتی ہوئی

صحت مند قدروں کو سہارا دینے کی کوشش کی جائے۔ عالمی سطح پر جب ہم کہانیوں کے علاوہ کسی بھی فن سے ملاقات کرتے ہیں تو ہمیں یہی احساس ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر فنکار کے احساس کی شدت الگ ہے، اس لئے وہ فن کو الگ الگ طریقوں سے اور الگ الگ اندازِ فکر کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ کون اس میں کتنا کامیاب ہے یہ فیصلہ قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔

مجھے پوری امید ہے کہ نثار احمد صدیقی کے اس مجموعے کا ادبی دنیا میں بہترین استقبال ہوگا اور فن کار کو ارتقائی سفر میں مدد کرے گا۔

نثار احمد صدیقی کی یہ کہانیاں زندگی کی کہانیاں ہیں گویا یہ مجموعہ زندگی نامہ ہے اسی طرح سمجھ کر اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

شان الرحمن

پٹنہ

Climax Anti Climax

Collection of Short Stories

By

Nesar Ahmad Siddiqui

Eram Publishing House Dariyapur, Patna - 4